یکم مارچ ۲۰۱۷ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۰ ۔ شمارہ نمبر: ۵

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ معارف فیچر ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لواز مہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لواز مہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ معارف فیچر کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤۔ ہمارے فراہم کردہ لواز مے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ معارف فیچر کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

چین کے لیے مواقع.....اور ہمارے لیے بھی!

Michael J. Mazarr

چین نے کم و بیش تین عشروں تک جو پالیسی اپنائی وہ خاصی کارگر ثابت ہوئی اور اس کے نتیجے میں چین کو معاشی و سیاسی سطح پر وہ استحکام حاصل ہوا، جس کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ مگر اب ایسا لگتا ہے کہ چین کی مجموعی پالیسی بحران کا شکار ہے۔ امریکا نے کچھ مدت قبل تائیوان کے معاملے میں اپنے موقف میں تبدیلی کا عندیہ دیا ہے مگر پھر فوراً ہی یہ ارادہ ترک کر دیا۔ تائیوان کو چین اپنا باغی صوبہ قرار دیتا ہے۔ اِسے ''ون چائنا'' پالیسی کہا جاتا ہے۔ امریکا نے چند ماہ کے دوران ''ون چائنا'' پالیسی اور بحیرۂ جنوبی چین میں پائے جانے والے تنازعات کے حوالے سے چین سے معاملات خاصے غیر معمولی اور قدرے انتہائی انداز سے نمٹائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چین سے بامقصد اور تعمیری تعلقات کا راگ بھی الاپا جا رہا ہے۔

پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ کس سمت لے جا رہا ہے مگر ایک بات طے ہے ..... یہ کہ اگر امریکی قیادت کسی نہ کسی طور چین کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتی ہے تو کسی نئے عالمی نظام کے چلانے اور اُس کی عمدہ کارکردگی کی ضمانت دینے والے ملک کی حیثیت سے امریکا کا کردار قبول کرنے کے معاملے میں چین کا تذبذب بلکہ مشکلات پیدا کرنے والا رویہ امریکی قیادت کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

حال ہی میں سوئٹزرلینڈ کے شہر ڈیووس میں بین الاقوامی اقتصادی فورم کے اجلاس میں چین کے صدر شی جن پنگ نے خاصی جاندار اور متاثر کن تقریر کی، جس میں انہوں نے عالمی معیشت کو ایک لڑی میں پرونے اور قوانین پر عمل کی بنیاد پر عالمی نظام تشکیل دینے کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے عالمی سطح پر ترقی و حکمرانی کے حوالے سے قابل عمل ایجنڈا پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس پر ابتدائی ردعمل شکوک سے مُزیّن تھا۔ چین چاہتا ہے کہ کوئی بھی نیا عالمی نظام امریکا تنہا تشکیل نہ دے۔ وہ اس کام میں نمایاں حد تک معاونت کرنے کا خواہش مند ہے۔ یہ امریکا کے لیے اچھا موقع ہے۔ اگر وہ کسی نئے عالمی نظام کی تشکیل میں چین کو ساتھ ملاتا ہے تو چین کی رضامندی کا حقیقی جائزہ لینے کا موقع بھی ملے گا۔

چینی صدر کی تقریر میں اور بہت کچھ تلاش کرنے کی کوشش لاحاصل رہے گی۔ اُنہوں نے ڈیووس اکنامک فورم کو چین کے متبادل اقتصادی اقدامات پیش کرنے اور ایشیا میں خراب ہوتی ہوئی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا۔ ان کی پوری تقریر اس امر کی مظہر تھی کہ چین کچھ کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اسے مغربی طاقتوں بالخصوص امریکا سے اشتراکِ عمل کی توقع ہے۔ صدر شی جن پنگ کی تقریر کو چین کے طویل المیعاد عزائم، منصوبوں اور مقاصد میں کسی بڑی تبدیلی کے مظہر یا خواہش کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ مگر خیر اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین نے جو تاریخی موقع فراہم کیا ہے اُسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔

امریکا نیا عالمی نظام لانا چاہتا ہے مگر دو عوامل ایسے ہیں جنہوں نے اس حوالے سے چین کے امریکا سے اشتراکِ عمل کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ اول تو یہ کہ ہر ابھرتی ہوئی قوت اپنی صلاحیت اور سکت سے کہیں زیادہ عزائم کو پروان چڑھانے لگتی ہے اور موجودہ قوتوں کو دھکا مار کر اسٹیج سے گرانا چاہتی ہے اور دوم یہ کہ چین مزاجاً خود کو ایشیا کا لیڈر سمجھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ چینی قیادت کو اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ امریکا اور یورپ نے مل کر چین کو صدیوں دبانے اور عالمی سیاست و سفارت و معیشت کے اعتبار سے پیچھے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

جو کچھ چند عشروں کے دوران ہوا ہے اُس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چین موجودہ عالمی نظام، اِس کے اطوار اور اداروں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ عالمی تجارتی تنظیم سے عالمی بینک اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں سے تعلقات کی نوعیت، بیرونی تجارت کے حوالے سے غیر معمولی پابندیوں کے اطلاق، سائبر میڈلنگ اور دوسرے بہت سے معاملات میں چینی رویے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ چینی قیادت موجودہ عالمی نظام میں شمولیت اختیار کرنے سے زیادہ اِسے نقصان پہنچانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

اندرونی صفحات پر:۔

- اِخوان المسلمون کی لیبلنگ
- مشرقِ وسطیٰ کے تیل کی حفاظت اور امریکا
- بنگلا دیش میں نصاب کا جھگڑا
- کم جونگ نام ''وی ایکس'' کا نشانہ کیسے بنے؟
- بھارت کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب
- پاکستان: دھماکوں کی موجودہ لہر کا مقصد
- ٹرمپ اور اسرائیل: خطرناک ملاپ!
- ''دنیا جنگ کی تیاری کر رہی ہے!''
- لال بھبھو کا اسرائیل

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

بات ایسی نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو دنیا ابھری اس میں چین ابتدا میں تو کمزور اور متذبذب تھا مگر پھر اس نے طاقتور ہونا شروع کیا۔ تین عشروں سے بھی زائد مدت کے دوران چین ایک بھرپور عالمی قوت بن کر ابھرا ہے، جس کے نتیجے میں اس کا اعتماد بھی بڑھا ہے۔ وہ اب زیادہ کھل کر سامنے آنا چاہتا ہے۔ کئی بین الاقوامی اداروں میں وہ اہم رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ چین نے اب تک اقوام متحدہ کے مجموعی نظام کو قبول کیا ہے اور اُسے مستحکم کرنے میں اپنا کردار عمدگی سے ادا کیا ہے۔ اس نے جوہری عدم پھیلاؤ اور دنیا بھر میں امن قائم کرنے سے متعلق اقوام متحدہ کے اقدامات کی بھرپور حمایت بھی کی ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے بعد سے چین کی ترقی کا سفر شروع ہوا۔ اس نے ایک مخصوص رفتار سے اپنی قوت میں اضافے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ ایک طرف تو چینی قیادت اس بات کی خواہش مند رہی ہے کہ عالمی اداروں اور نظام کا حصہ بن کر اپنی طاقت میں اضافہ کرے اور دوسری طرف امریکا یہ چاہتا ہے کہ چین کو اپنے ساتھ ملا کر عالمی نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرے۔ دونوں بڑی قوتیں اپنے اپنے مقصد کے حصول میں بہت حد تک کامیاب رہی ہیں۔ صدر شی جن پنگ نے ڈیووس میں اپنی تقریر میں بھی کہا کہ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عالمی اداروں کے ساتھ مل کر چلنا ہی درست رجحان ہے اور اِسی صورت بہتر انداز سے کام کیا جاسکتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ چین اس وقت جو کچھ کر رہا ہے اُس سے ہٹ کر بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ چینیوں کی نفسی ساخت میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اُن سے ناانصافی روا رکھی گئی ہے، انہیں دبا کر رکھا گیا ہے۔ مزید طاقت حاصل کرنے پر چین کی طرف سے ایسے اقدامات بھی سامنے آسکتے ہیں جن کا بنیادی مقصد صدیوں ڈھائے جانے والے مظالم کا بدلہ لینا ہو۔ واشنگٹن کے پالیسی ساز بھی یہی سمجھتے ہیں کہ چین اپنا کھویا ہوا کردار بحال کرنے پر مائل ہوسکتا ہے۔ ایسے میں اُس کی طرف سے طاقت کے استعمال کا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ واشنگٹن میں یہ احساس بھی شدت سے پایا جاتا ہے کہ چین کے عزائم کو ایک مشترکہ نظام کی حدود میں مقید نہیں رکھا جاسکتا۔

وقت آگیا ہے کہ چین کے عالمی کردار کا تعین کیا جائے اور اُسے ساتھ مل کر کام کرنے پر رضامند کیا جائے۔ ڈیووس میں صدر شی جن پنگ نے جو تقریر کی وہ اس حوالے سے بہت کچھ بیان کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکا اور یورپ کو چین کے حوالے سے ایک اہم موقع ہاتھ لگا ہے۔ ایک طرف چین کچھ کرنا چاہتا ہے یعنی وہ اپنے لیے وسیع تر عالمی کردار تلاش کر رہا ہے اور دوسری طرف امریکا اور یورپ بھی چین سے لاحق خطرے کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چین سے کوئی بڑا باضابطہ معاہدہ معاملات کو درست کرنے کی راہ میں اہم سنگِ میل ثابت ہوسکتا ہے۔

صدر شی جن پنگ کی تقریر اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ چین عالمی نظام میں اپنے لیے معقول کردار چاہتا ہے۔ اس کردار کے عوض وہ بڑی طاقتوں سے بھرپور اشتراکِ عمل کے لیے بھی تیار ہے۔ امریکا اور یورپ کے لیے یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ چین کے عزائم سے خوفزدہ ہونے اور عمل کی دنیا میں کچھ کرنے سے گریز کی راہ پر گامزن رہنے کے بجائے امریکا اور اس کے حلیف چینی قیادت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم آپ کی بات پر بھروسا کرنے اور آپ کو عالمی نظام میں ایک بڑا کردار دینے کو تیار ہیں مگر اس کی چند شرائط ہوں گی۔ اور اگر چینی قیادت گرین سگنل دے تو شرائط پر رفتہ رفتہ عمل کرایا جاسکتا ہے۔ اِسی صورت ایک نیا اور زیادہ مستحکم عالمی نظام فروغ پاسکتا ہے۔ چین کی بڑھتی ہوئی قوت سے ٹکرانے کے بجائے اُسے عالمی نظام کا حصہ بنا کر اُس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی صورت ہی میں دنیا کو پرامن رکھا جاسکتا ہے۔ چین کی بڑھتی ہوئی قوت کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً چند کلیدی معیارات بھی نافذ کیے جاسکتے ہیں۔

عالمی نظام کو جامع اور مستحکم بنانے کے تین بنیادی اصول ہیں:

☆ عدم جارحیت

☆ قانون کی حکمرانی

☆ معیاری تجارت

ان میں سے ہر درجے میں امریکا اور دیگر بڑی قوتیں چین کو ساتھ ملا کر چل سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں چین سے اپنی مرضی کا کردار ادا کروانا بہت زیادہ مشکل نہ رہے گا۔ عالمی معاملات میں چین کے دعووں اور قضیوں نیز عالمی تجارت سے متعلق چین کی شکایات اور خدشات دور کرنے میں مرحلہ وار ہی کامیابی مل سکتی ہے۔ چین جو کچھ چاہتا ہے اس کے حوالے سے امریکا اور اس کے حلیفوں کے اقدامات سے چین کو اسی جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا چاہیے، جو صدر شی جن پنگ کی بیان کردہ پالیسی کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔

چینی قیادت عالمی نظام کے ساتھ چلنے کو تیار دکھائی دے رہی ہے۔ امریکا اور یورپ مل کر چین کو نئے اور تیزی سے ابھرتے ہوئے عالمی نظام کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ یہ بنیادی اقدام چینی قیادت کے عزائم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا موقع بھی فراہم کرے گا۔ اس صورت میں امریکی پالیسی میں بھی واضح تبدیلی دکھائی دے گی، جس کا اب تک مقصد یہی رہا ہے کہ چین کو کسی نہ کسی طور امریکی قیادت میں کام کرنے والے عالمی نظام کے دائرے میں لے آیا جائے۔ یہ پالیسی اب کام نہیں کرسکتی۔ اس وقت چین کسی بھی سطح پر اس موڈ میں نہیں ہے کہ کوئی اس پر اپنی رائے یا مرضی مسلط کرے۔ وہ کسی بھی نظام کا حصہ بننے کو تیار ضرور ہے مگر اپنی شرائط پر اور اپنی سہولت کے مطابق۔ عالمی تجارت اور اقتدارِ اعلیٰ سے متعلق قضیوں اور مناقشوں میں چین کی پالیسی بہت حد تک ویسی ہی ہے جیسی پتھر پر لکیر ہوا کرتی ہے۔ بیشتر بین الاقوامی معاملات میں وہ اب تک قائدانہ کردار سے گریز کرتا آیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اُسے امریکا اور یورپ پر پورا یقین نہیں۔

صدر شی جن پنگ نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد پر چین سے اشتراکِ عمل بڑھانے میں کچھ ہرج نہیں۔ امید یہی ہے کہ چین عالمی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر چلنے کو ترجیح دے گا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی نا کہ وہ موجودہ عالمی نظام کی چُولیں ہلا دے گا! اگر ایسا ہوا تب بھی امریکا کے لیے الگ سے کچھ کر دکھانے کا موقع ضرور پیدا ہوگا۔ (Michael J. Mazarr رینڈ کارپوریشن میں سینئر پولیٹیکل سائنٹسٹ اور نئے پائیدار عالمی نظام کی تیاری سے متعلق منصوبے کے سربراہ بھی ہیں۔)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"China's Opportunity .... and ours!"
("rand.org". Feb.19, 2017)

روشن آبگینے

(تذکرۂ محسنات)

مرتبہ: روبینہ فرید

کتاب کا نیا ایڈیشن دستیاب ہے!

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک ۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

اِخوان المسلمون کی لیبلنگ

Benjamin Wittes

امریکا میں دائیں بازو کے عناصر ایک زمانے سے اس امر کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا جائے۔ اب جبکہ منہ پھٹ اور فکری اعتبار سے غیر متوازن ڈونلڈ ٹرمپ ایوان صدر میں ہیں، اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے سے متعلق کوششوں میں تیزی آ گئی ہے۔ سینیٹر ٹیڈ کروز نے کانگریس میں ایک مسودہ قانون متعارف کرایا ہے، جس کے تحت وزیر خارجہ کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ کانگریس کو بتائے کہ اخوان دہشت گرد قرار دیے جانے سے متعلق معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں! اور اگر نہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی اہم نکتے کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔

نیویارک ٹائمز نے حال ہی میں اطلاع دی ہے کہ صدر ٹرمپ ایک ایگزیکٹو آرڈر جاری کرنے کی تیاری کر رہے ہیں جس میں وزیر خارجہ کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے سے متعلق جواز پیش کریں۔ یاد رہے کہ مصر اور متحدہ عرب امارات چاہتے ہیں کہ اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دیا جائے۔

اِخوان المسلمون کو دہشت گرد قرار دینے کا آئیڈیا نیا نہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ بھی انتہائی دائیں بازو کے اس مطالبے کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہیں۔ یہ معاملہ بہت حد تک ''ریڈیکل اسلام'' کے خلاف جاری ''تہذیبی جنگ'' سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ امریکی اخبار وال اسٹریٹ جرنل میں یاروسلیف ٹروفیموف نے لکھا ہے کہ اخوان کو دہشت گرد قرار دینا ایسا آسان بھی نہیں۔ اب بھی اس تنظیم کے کروڑوں حامی موجود ہیں۔ دہشت گرد قرار دیے جانے کی صورت میں کئی ممالک سے امریکا کے تعلقات میں کشیدگی آ سکتی ہے۔ ان میں ترکی بھی شامل ہے۔

نیتھن براؤن اور مائیکل ڈن نے بھی خبردار کیا ہے کہ اخوان کو دہشت گرد قرار دینے سے مقاصد تو کیا حاصل ہوں گے، الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اخوان اور اس قبیل کی متعدد تنظیمیں بہت حد تک پُرامن رہتے ہوئے رفاہی کام بھی کر رہی ہیں۔ اگر انہیں دہشت گرد قرار دے دیا گیا تو کروڑوں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ انہیں یہ پیغام جائے گا کہ پرامن رہتے ہوئے بھلائی کے کام کرنے والے اداروں کو بھی امریکا اور اس کے حلیف نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے کسی بھی اعلان کو بہت حد تک مجموعی طور پر پورے عالم اسلام کے خلاف اعلانِ جنگ تصور کیا جائے گا۔

اگر ڈونلڈ ٹرمپ نے اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے سے متعلق کوئی اقدام کیا تو ایک بڑی قباحت کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ کہ ایسا کرنا سراسر غیر قانونی ہوگا۔ معاملہ یہ ہے کہ اخوان کسی بھی اعتبار سے ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں پائی جا رہی، جن کی بنیاد پر اسے غیر قانونی اور دہشت گرد قرار دیا جا سکے۔ ایسے میں اگر ڈونلڈ ٹرمپ نے اُسے غیر قانونی قرار دینے کی طرف قدم بڑھایا تو معاملات مزید خرابی کی طرف جائیں گے اور عالم اسلام میں مجموعی طور پر امریکا مخالف ماحول مزید پروان چڑھے گا۔ امریکی قوانین نے وزیر خارجہ کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ محسوس کریں کہ کوئی بھی غیر امریکی تنظیم دہشت گردی میں ملوث ہو، امریکا کی قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتی ہو، امریکیوں کی زندگی خطرے میں ڈالنے کا باعث بن سکتی ہو، امریکی مفادات کو داؤ پر لگا سکتی ہو تو اسے دہشت گرد قرار دیا جائے۔ اس وقت اخوان ایسی کسی بھی سرگرمی میں ملوث دکھائی نہیں دے رہی جو متعلقہ معیارات پر پوری اترتی ہو۔ ایسے میں اخوان کو دہشت گرد قرار دینا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسا کرنے سے امریکا کے انتہائی متنازع اقدامات میں اضافہ ہوجائے گا۔ وزیر خارجہ کے لیے لازم ہے کہ جس تنظیم کو وہ دہشت گرد قرار دینا چاہتے ہیں اس کے بارے میں تمام بنیادی اور حساس باتیں فیڈرل جرنل میں لکھیں۔ یہ باتیں خفیہ بھی رکھی جا سکتی ہیں۔ جس تنظیم کو دہشت گرد قرار دیا گیا ہو، وہ ڈی سی سرکٹ کورٹ آف اپیل میں نظر ثانی کی درخواست دے سکتی ہے اور اگر امریکی انتظامیہ نے اسے دہشت گرد قرار دینے سے متعلق تمام معاملات کا خیال نہیں رکھا، متعلقہ ریکارڈ ناکافی ہے تو عدالت کے لیے ذریعے دہشت گردی کا لیبل ہٹوایا بھی جا سکتا ہے۔ کورٹ آف اپیل میں ایک تنظیم کا کیس کئی سال تک چلتا رہا۔ یہ ماننے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ کورٹ آف اپیل ناکافی شواہد کی بنیاد پر کوئی فیصلہ سنا دے گی۔

آیئے! اب اس سوال کا جائزہ لیں کہ کیا اخوان ایک ایسی غیر ملکی تنظیم ہے جو دہشت گردی میں ملوث ہے، یا ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس سے امریکا یا اس کے شہریوں کو خطرات لاحق ہیں۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اخوان ایک تنظیم کا نام نہیں۔ اس تنظیم کے کئی حصے یا پہلو ہیں۔ چند ایک حصے ایسے ہیں جن کے بارے میں دہشت گردی کا شبہ ہوسکتا ہے اور چند ایسے ہیں جن کے دہشت گرد ہونے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ مجموعی طور پر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اخوان ایک ایسی تنظیم ہے جس سے امریکی سرزمین اور اس کے شہریوں کو بظاہر کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

اِخوان المسلمون ۱۹۲۸ء میں مصر میں قائم کی گئی تھی۔ اس کا صدر دفتر اب بھی مصر ہی میں ہے۔ کئی ممالک میں اخوان کی شاخیں ہیں اور یہ تمام شاخیں مل کر ہی کام کرتی ہیں۔ مصر میں سپریم گائیڈ ان کے لیے رہنما کردار ادا کرتی ہے۔ بہت سے ممالک میں اخوان کی شاخیں زیادہ کھل کر کام کرتی ہیں اور ان کے معاملات میں شفافیت بھی دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصر میں اخوان بہت حد تک خفیہ رہ کر کام کرتی رہی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مصر میں قائم ہونے والی فوجیں حکومتیں اخوان کو کچلتی رہی ہیں اور ان سے بچنے کے لیے خفیہ رہتے ہوئے کام کرنا ہی زیادہ مناسب تھا۔

دستیاب شواہد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اخوان کی بین الاقوامی تنظیم (التنظیم العالمی یا التنظیم الدولی) ماتحت گروپوں کو کسی بھی اعتبار سے اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کسی بھی ملک میں کام کرنے والی اخوان کی شاخ اپنی حکومت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلامی شریعت نافذ کی جائے مگر اس مقصد کے حصول کے طریقے مختلف ہیں۔ ہر ملک میں اخوان کی شاخ اپنے ڈھنگ سے کام کرتی ہے۔ اخوان کی شاخیں مرکزی ڈھانچے سے اختلاف کرتے ہوئے اس سے الگ بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً کویت میں اخوان کی شاخ نے صدام حسین کی طرف سے کویت پر قبضے کی حمایت کی تھی جس کے نتیجے میں مرکزی تنظیم سے اس کے اختلافات ہوئے اور وہ الگ بھی ہوگئی۔ اس وقت اخوان کی شاخیں ایک ڈھیلے ڈھالے نظام کے تحت آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہر شاخ اپنے طور پر کام کرتی ہے۔ کبھی کبھی اجلاس ہوتے ہیں، جن میں ایک دوسرے کے تجربات سنے جاتے ہیں اور بس۔ اخوان کی کسی بھی شاخ کو کسی ایجنڈے یا پروگرام پر عمل کے حوالے سے مجبور یا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اخوان کی تمام شاخیں ایک بین الاقوامی ایجنڈے پر متفق ضرور ہوتی ہیں مگر اسے غیر معمولی ترجیح نہیں دیتیں۔

حماس کی شاخیں دہشت گردی اور سیاسی تشدد کی راہ پر بھی گامزن ہوتی ہیں۔ شام میں اخوان کی شاخ نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں حکومت کے خلاف طویل لڑائی میں

حصہ لیا۔ فلسطین میں اخوان کی شاخ، حماس، سیاسی تشدد کی حامی رہی ہے اور اسرائیل پر متعدد حملوں میں عملی کردار ادا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ حماس کو امریکی محکمہ خارجہ نے دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ مصر میں اِخوان المسلمون نے ۱۹۴۰ء، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں حکومت کے خلاف دہشت گردی اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ بعد میں اخوان کے دوسرے لیڈروں نے دہشت گردی کی پالیسی باضابطہ طور پر ترک کرنے کا اعلان کیا۔ ۲۰۱۳ء میں منتخب صدر محمد مرسی کی برطرفی اور گرفتاری پر بھی اخوان نے تشدد کا راستہ نہیں اپنایا۔ حد یہ ہے کہ رباع مسجد میں ایک ہزار سے زائد اخوان کارکنوں کی شہادت کے بعد بھی قائدین نے تشدد کی راہ پر گامزن ہونے کی ہدایت نہیں کی۔ مصر میں اخوان کے قائدین کی بنیادی ہدایت ہے کہ تشدد سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ اخوان کے بعض کارکنان حکومتی ہتھکنڈوں کے باعث مجبور ہو کر تشدد پر اتر آتے اور نجی و سرکاری املاک کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں مگر مجموعی طور پر تنظیمی ڈھانچا تشدد کو دوبارہ اپنانے کی بات نہیں کرتا۔ مصر میں اخوان کے بعض کارکنوں نے قبطی عیسائیوں کو بھی نشانہ بنایا ہے مگر یہ پارٹی پالیسی نہیں۔ بعض تجزیہ کاروں کا یہ خیال ہے کہ مصر میں اخوان کے خلاف جو کریک ڈاؤن کیا گیا اور جتنے بڑے پیمانے پر گرفتار کر کے کارکنوں کو سزائیں سنائی گئیں اس کے نتیجے میں بہت سے کارکن اب قائدین کی ہدایات کی بھی پروا نہیں کرتے اور کریک ڈاؤن کے جواب میں تشدد پر اتر آتے ہیں۔ پارٹی کے بیشتر بڑے عہدیداروں کی گرفتاری نے تنظیم میں اندرونی سطح پر انتشار پیدا کیا ہے اور کریک ڈاؤن کے جواب میں پرامن احتجاج تمام کارکنوں کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اخوان کے بہت سے کارکن تشدد یا دہشت گردی پر مائل ہیں مگر اس سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ تنظیم دہشت گردی کی راہ پر گامزن ہے، یا ایسا کرنے کا بھرپور ارادہ رکھتی ہے۔

برطانوی خبر رساں ادارے رائٹرز نے امریکی محکمہ خارجہ کے ایک افسر کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ امریکی خفیہ ادارے اخوان کے بارے میں جو معلومات فراہم کرسکے ہیں اُس کا جائزہ لینے اور بھرپور بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جاسکا ہے کہ اس وقت اخوان کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ وہ کسی بھی سطح پر دہشت گرد دکھائی دے رہی ہے نہ ایسا کرنے کا ارادہ دکھائی دے رہا ہے۔

بہت سے ممالک میں اخوان کی شاخیں انتہائی پرامن طریقے سے کام کر رہی ہیں۔ حکومتوں نے اِخوان المسلمون کو سیاسی سرگرمیوں اور انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی دی ہے۔ کویت، اردن، بحرین، یمن اور اسرائیل میں اخوان سیاست میں حصہ بھی لیتی ہے اور پارلیمنٹ میں اس کی نمائندگی بھی ہے۔ امریکی تسلط کے دوران عراق کے نائب صدر اخوان کے رکن تھے۔ مراکش میں اِخوان المسلمون سے نظریاتی ہم آہنگی رکھنے والی جماعت نے گزشتہ حکومت کی سربراہی کی تھی اور ممکنہ طور پر آئندہ حکومت بھی اِسی پارٹی کی ہوگی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مراکش بھی امریکی شراکت داری ہے۔ اگر امریکا نے اخوان المسلمون پر پابندی عائد کی تو ہوسکتا ہے کہ مراکش کی قیادت سے بھی اس کے تعلقات کشیدہ ہوجائیں۔

اسرائیل میں اخوان المسلمون کے سربراہ شیخ درویش سے ملاقات کرنے والے ایک مصنف نے بتایا کہ اخوان کا ڈھانچا سیاسی ہے اور جمہوریت کا حامی بھی۔ اخوان چاہتی ہے کہ سیاسی عمل میں حصہ لے کر منتخب اداروں میں نمائندگی بڑھائی جائے تاکہ سسٹم کے ساتھ رہتے ہوئے کام کرنا ممکن ہو۔ اخوان نے اسرائیل میں میونسپل اور قومی اداروں تک رسائی چاہی ہے۔ انقلابی نظریات رکھنے والوں نے شیخ درویش سے دوری اختیار کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں اسرائیلی پارلیمنٹ کنیسوٹ کے انتخاب میں حصہ لینا اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شیخ درویش نے حماس کا غیر ضروری طور پر دفاع کرنے سے گریز کیا ہے۔ شیخ درویش کی سوچ منفرد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ایک انسان ہوں، مسلم ہوں اور عرب بھی ہوں۔ میں اپنی سرزمین پر رہتا ہوں جو اب اسرائیل کا حصہ ہے۔ میں چونکہ اس سرزمین کا حصہ ہوں اس لیے اس کے شہریوں سے کسی بھی سطح پر نفرت کرتا ہوں نہ کوئی بدگمانی پالتا ہوں۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ فلسطینیوں، اسرائیل میں آباد مسلمانوں اور اسرائیل کے غیر مسلم شہریوں کے درمیان ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے تاکہ قتل و غارت کا خاتمہ ہو اور ایک دوسرے کو قبول کرنے کی فضا مزید پروان چڑھے۔ آج چند ایک ممالک ہی نے اپنی ٹاؤٹ کورٹس کے ذریعے اخوان کو دہشت گرد قرار دے رکھا ہے، جن میں مصر، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، روس اور شام شامل ہیں۔ چند ایک ممالک نے مقامی شاخوں کو دہشت گرد قرار دیا ہے۔ یہ سب کچھ ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

اخوان یا کسی بھی اور تنظیم کو دہشت گرد قرار دیا جاسکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کے خلاف شواہد ہوں اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہو کہ وہ دہشت گردی میں ملوث ہے۔ اگر اخوان کی کوئی شاخ سیاسی تشدد یا دہشت گردی کی طرف مائل ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اخوان کو مجموعی طور پر دہشت گرد قرار دے دیا جائے۔ اِخوان المسلمون کی مجموعی پالیسی تشدد اور دہشت گردی سے گریز کی ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا لازم ہے۔

امریکا میں انتہائی دائیں بازو کے عناصر چاہتے ہیں کہ اخوان کو دہشت گرد قرار دیا جائے مگر محض دباؤ یا جذبات کے تحت ایسا کرنا انتہائی احمقانہ عمل ہوگا۔ امریکی محکمہ خارجہ کے پاس اخوان کے خلاف شواہد انتہائی ناکافی ہیں۔ اگر وہ تمام معیارات کا خیال رکھے بغیر اخوان کو دہشت گرد قرار دے گا تو یہ عمل سراسر غیر قانونی کہلائے گا اور اس کے نتیجے میں ٹرمپ انتظامیہ مزید متنازع ہو جائے گی۔ مصر میں اخوان خالص جمہوری ڈھانچے میں رہتے ہوئے غیر لبرل ایجنڈے کے لیے فعال ہے مگر اِسے کسی بھی اعتبار سے غیر قانونی عمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ محض نظریاتی بنیاد پر کسی بھی تنظیم کو دہشت گرد قرار دے کر اس پر پابندی عائد کرنا کسی بھی اعتبار سے قانونی عمل نہیں۔

امریکی سپریم کورٹ نے ۲۰۱۰ء میں اپنی ایک رولنگ میں کہا تھا کہ کسی بھی دہشت گرد تنظیم کو مالی مدد فراہم کرنا بھی دہشت گردی میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بالکل درست بات ہے مگر اس کا اطلاق اخوان پر نہیں ہوتا کیونکہ یہ تنظیم مجموعی طور پر سیاست اور امن کی بات کر رہی ہے۔ مثلاً اسرائیل میں شیخ درویش کے گروپ کو مالی امداد فراہم کرنا کسی بھی اعتبار سے دہشت گردی کی حمایت نہیں کیونکہ یہ گروپ کسی بھی سطح پر دہشت گردی میں ملوث ہے نہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ امریکی سپریم کورٹ نے مالی تعاون سے متعلق جو رولنگ دی ہے، اس کا اطلاق ہر معاملے پر نہیں کیا جاسکتا۔

امریکا کئی سال سے مختلف گروپوں کو دہشت گرد قرار دینے میں ناکام رہا ہے یا شاید ایسا کرنے سے گریز کیا جاتا رہا ہے۔ بات یہ نہیں کہ سابق یا ان سے پہلے امریکی صدر کو اخوان کے حامیوں نے گھیر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی قیادت کے پاس اخوان اور دوسرے بہت سے گروپوں کے پاس ایسے شواہد ہیں ہی نہیں جن کی بنیاد پر انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کی تمام سرگرمیوں پر پابندی عائد کی جاسکے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Should the Muslim Brotherhood be Designated a Terrorist Organization?".
("lawfareblog.com". January 27, 2017)

مشرقِ وسطیٰ کے تیل کی حفاظت اور امریکا

John Glaser

پندرہ برس سے مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کے تجربات خاصے تکلیف دہ ثابت ہوئے ہیں۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے عراق، شام، لیبیا اور افغانستان میں امریکی پالیسی کی ناکامی سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور یوں غیر معمولی سیاسی فائدہ اٹھایا ہے۔ ٹرمپ نے ایک ریلی سے خطاب میں یہ بھی کہا تھا کہ جن حکومتوں کو امریکا نہیں جانتا ان کا تختہ الٹنے سے گریز کیا جائے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ مداخلت کرنے کا تباہ کن چکر اب ختم کیا جانا چاہیے کیونکہ اس کے نتیجے میں صرف افراتفری پھیلتی ہے، اور کچھ نہیں۔

صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے جنگجویانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنی کابینہ میں ایسے افراد کو شامل کرلیا ہے، جو دوسرے ممالک میں مداخلت کے مخالف نہیں رہے۔ مستقل مزاجی ایک طرف، ایسا لگتا ہے کہ ووٹروں نے اس بات کو پسند کیا کہ انہوں نے مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت کرنے کی پالیسی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

تاہم مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی کی جانچ کا معیار محض ناپسندیدہ حکومتیں تبدیل کرنے یا دہشت گردوں کا تعاقب کرنے سے کہیں بڑھ کر ہونا چاہیے۔ افغانستان میں قوم سازی اور داعش سے لڑنے کی ہماری ناکام کوششوں کے علاوہ ہمارے پاس مداخلت کا جواز تیل رہا ہے۔ اب حالات نے ثابت کردیا ہے کہ وہاں تعینات دستے تیل کی آزادانہ ترسیل کے لیے کافی نہیں۔ اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں ۳۵ ہزار امریکی فوجی تعینات ہیں۔ ان میں سے ۱۳ ہزار کویت اور ۵ ہزار بحرین میں ہیں۔ ان کی تعیناتی کا بنیادی مقصد توانائی کے وسائل کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں امریکی فوج کی تعیناتی کے توانائی سے متعلق ۴ مقاصد ہیں:

۱) کسی علاقائی طاقت کو سر اٹھانے سے روکنا کہ مبادا وہ تیل کے وسائل پر قبضہ کرلے۔

۲) کسی بیرونی طاقت کو علاقے میں مداخلت سے روکنا۔

۳) علاقائی کشمکش کو محدود کرنے کی کوشش تاکہ وہ کسی وسیع جنگ کی صورت نہ اختیار کرے اور یوں تیل کی فراہمی متاثر نہ ہو، اور

۴) آبنائے ہرمز کو بند کرنے کی کسی بھی کوشش کو ناکام بنانا۔

آبنائے ہرمز سے تیل کی عالمی رسد کا ۳۰ فیصد گزرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا امن کے زمانے میں تعینات فوج نے ان مقاصد کا حصول یقینی بنایا ہے؟ چارلس ایل گلیسر اور روز میری اے کیلانک کے مطابق ''روایتی دانائی کے مطابق امریکا کے خلیج کے تیل سے وابستہ مفادات کو بے حد خطرات لاحق ہوچکے ہیں، چنانچہ امریکا کے لیے لازم ہوگیا ہے کہ عسکری صلاحیت بروئے کار لاکر ان کا دفاع کرے۔ تاہم آج یہ معروضہ غلط ثابت ہوچکا ہے''۔

ڈینیل ایف ایس کوہن اور جوناتھن کرشنر کا کہنا ہے کہ ''توانائی کا عدم تحفظ'' پالیسی سازوں کے لیے ایک معمول کی بات ہے۔ کچھ دانشور اسے محض ایک اسطوری داستان سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ توانائی کے وسائل کی حفاظت کے لیے وسیع فوجی وسائل مختص کرنا ایک بھاری غلطی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج امریکا کا خلیج کے تیل پر انحصار ماضی کی نسبت بہت کم ہوچکا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں امریکا میں استعمال ہونے والا صرف ۲۴ فیصد تیل خلیجی ممالک سے درآمد کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے خلیج سے تیل کی درآمد میں اتنی کمی کبھی نہیں دیکھنے میں آئی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی بدولت امریکا ساحلی چٹانوں سے تیل حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ ۲۰۰۸ء سے امریکا کی خام تیل کی پیداوار میں ۷۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ امکان ہے کہ ۲۰۲۰ء تک درآمدی حجم ۵۵ فیصد تک کم ہوجائے گا۔ کینیڈا کی تیل کی پیداوار بھی ۲۰۴۰ء تک دگنی ہوجائے گی۔ شمالی امریکا بھی ۲۰۲۰ء تک تیل برآمد کرنے والا اہم خطہ بن جائے گا اور یہ صورت حال ۲۰۴۰ء تک برقرار رہے گی۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ تیل عالمی تجارت کی اہم ترین جنس ہے اور دیگر اجناس کی طرح اس پر بھی طلب اور رسد کے قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ کسی بھی رسد کے ذریعے پیدا ہونے والے مسائل سے اس کی قیمت متاثر ہوتی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد سے آنے والے ہر آئل شاک کے بعد عالمی مارکیٹ نے خود کو رسد کے دیگر ذرائع کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی اور یوں تیل کے نرخوں کو بے قابو ہونے سے روکا۔ منڈی میں ہونے والے اس تغیر نے آئل شاک کے نتائج اور مضمرات کو کم کردیا، یہاں تک کہ رسد اور نرخ معمول پر آگئے۔ اہم بات یہ ہے کہ خلیج میں موجود امریکی فوج نے اس تعطل کو نہیں روکا اور نہ ہی اس کے نتیجے میں ہونے والے مالی خسارے کا مداوا کیا۔

عالمی سطح پر اور خطے میں طاقت کا توازن، توانائی کی سیکورٹی کے حق میں ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کے خلیج میں قدم جمانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوویت یونین بہرحال آج موجود نہیں اور موجودہ روس کو معاشی مسائل نے گھیرا ہوا ہے۔ وہ چند ایک چھوٹی موٹی کارروائیاں تو کرسکتا ہے مگر مشرقِ وسطیٰ میں قدم جمانے کی پوزیشن میں نہیں۔ چین کی طاقت میں اضافہ ضرور ہو رہا ہے مگر وہ ایشیا پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ وہ سیاسی اور معاشی طور پر خلیج کا رخ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جوشارونر کے مطابق ''اگلے بیس سال تک خلیج سے کسی طاقت کے ابھرنے اور تیل کے وسائل پر قبضہ کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر وہاں سے امریکا اپنی فوج کو مکمل طور پر نکال لے تب بھی ایسا نہیں ہوگا''۔

یہ تینوں عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ خلیج میں کسی بیرونی طاقت کا تیل کے وسائل پر قبضہ کرنا اور کسی علاقائی طاقت کا تیل پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ وہاں امریکی فوج کی موجودگی تیل کی محفوظ پالیسی کو یقینی بنانے کے لیے کافی ہے؟ اس کا جواب غالباً نفی میں ہوگا۔ اس وقت امریکی نیوی کا پانچواں بیڑا بحرین کے پانیوں اور خلیج میں یومیہ بنیاد پر گشت کرتا ہے۔ اس کی موجودگی میں ایران اگر چاہے بھی تو آبنائے ہرمز بند کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آبنائے ہرمز کو بند کرنے سے خود ایرانی مفادات کو سخت نقصان پہنچے گا۔ نیز اب جبکہ جوہری تصفیے کے بعد ایران سے پابندیاں بھی اٹھائی جارہی ہیں وہ ایسی کوئی حماقت کرنے سے گریز ہی کرے گا، جس کی پاداش میں وہ دوبارہ پابندیوں کی زد میں آئے۔ اگر ایران ایسا کرتا ہے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ خودکشی پر تُلا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ آبنائے ہرمز بند کرنے کی صورت میں صرف امریکا نہیں، اُسے عالمی فوجی اتحاد کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسے ۱۹۹۰ء میں کویت پر قبضے کی صورت میں عراق کو کرنا پڑا۔ آبنائے ہرمز کو بند کرنے میں چند ایک عملی رکاوٹیں بھی ہیں۔ یہ آبی گزرگاہ بہت وسیع ہے اور اسے کوئی غیر معمولی بحری قوت ہی بند کرسکتی ہے۔ اور ایران میں اتنی صلاحیت نہیں۔ کیا عالمی برادری اتنی وسیع آبی گزرگاہ میں کسی ملک کو بارودی سرنگیں بچھانے کی اجازت دے گی؟

باقی صفحہ نمبر ۱۰

بنگلا دیش میں نصاب کا جھگڑا

Ellen Barry and Julfikar Ali Manik

بنگلا دیش کی وزارت تعلیم نے درسی کتب کا تازہ ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ علماء کے ایک گروہ نے مطالبہ کردیا کہ نصاب سے ۱۷/ایسی نظمیں اور کہانیاں خارج کردی جائیں جو سراسر الحاد پرستی پر مبنی ہیں۔

یکم جنوری کو بہت سے اسکولوں میں درسی کتب متنازع قرار پانے والی نظموں اور کہانیوں کے بغیر تقسیم کردی گئیں اور حکومت کی طرف سے کوئی وضاحت بھی نہیں کی گئی۔ علمائے کرام کے کہنے پر چند ایک تبدیلیاں کی گئیں۔ مثلاً انگریزی کے حرف O سے شروع ہونے والے ایک لفظ کو Orna سے تبدیل کیا گیا، جو دوپٹے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی چھٹی کلاس کے طلبہ و طالبات کے لیے N سے ایک ہندو زیارت کے بجائے مصر کے دریائے نیل کو شامل کیا گیا ہے۔

عام بنگلادیشیوں کو ان چھوٹی سی تبدیلیوں میں کوئی خاص بات دکھائی نہیں دی مگر دانشوروں کو فکر لاحق ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں حکومت انتہا پسندوں کے دباؤ میں ہے اور شدت پسندی اب درسی کتب میں بھی داخل ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

دو ڈھائی عشروں کے دوران بنگلا دیش میں انتہا پسند سوچ تیزی سے پروان چڑھی ہے۔ دائیں بازو کے شدت پسندوں نے سیکولرازم کی بات کرنے والے دانشوروں کو نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے حکومت کو خاصی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ دوسری طرف بنگلادیشی معاشرے میں ایسی خواتین کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جو پردے کی طرف مائل ہیں۔ وہ اب حجاب استعمال کرنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ مدارس میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

بنگلا دیش میں اسلامی تنظیمیں اپنی بات منوانے کے لیے غیر معمولی حد تک کوشاں رہی ہیں۔ اب جبکہ وہ درسی کتب میں تبدیلی کرانے میں کامیاب رہی ہیں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا اثر و رسوخ کس قدر بڑھ گیا ہے کہ خود کو سیکولرازم کی علم بردار کہنے والی عوامی لیگ اقتدار میں ہونے کے باوجود ان کے آگے بہت حد تک بے بس ہے۔

بنگلا دیش میں اسکول کی سطح کے نصاب میں اسلامی امور کا داخل کیا جانا ایک ایسی حقیقت ہے جو امریکا کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے الگ ہوکر جب بنگلا دیش کی شکل اختیار کی تھی تب اس ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد سیکولرازم اور جمہوریت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا تھا۔

بنگلا دیش کے قیام کے دو ڈھائی عشروں بعد تک معاملات قابو میں رہے۔ سیکولر اور جمہوری روایات کا غلغلہ رہا۔ اس دوران پاکستان اور افغانستان میں اسلامی شدت پسند تنظیمیں تیزی سے پنپتی رہیں۔ ان کے اثرات کا دائرہ وسیع ضرور ہوا مگر بنگلا دیش جیسے ممالک میں ان کی دال زیادہ نہ گل سکی۔ بنگلا دیش کی آبادی کی اکثریت ناخواندہ اور غریب ہے مگر اس کے باوجود اسلامی شدت پسند تنظیموں کو بنگلا دیشی معاشرے میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں نہ مل سکے جو ان کی بات پر کان دھریں اور ان کے نظریات کو اپنائیں۔

چند برسوں کے دوران بنگلا دیش میں اسلامی شدت پسندی نے تیزی سے زور پکڑا ہے۔ سیکولرازم کی بات کرنے والے دانشوروں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ عوامی سطح پر سیکولرازم کی بات کرنا اب خطرناک ہوتا جارہا ہے۔ چند سیکولر دانشوروں کے قتل اور دوسروں پر قاتلانہ حملوں نے معاملات کو بہت حد تک الجھا دیا ہے۔ ایسے میں سیکولر روایات کو برقرار رکھنا انتہائی دشوار ہوتا جارہا ہے۔ الحاد کی بات کرنے والے بلاگر بھی اب خود کو خطرے میں محسوس کرنے لگے ہیں۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ معاملات اب اس حد تک نہیں ہیں کہ انہیں نظر انداز کردیا جائے۔ اسلامی تنظیمیں بہت منظّم ہوکر کام کر رہی ہیں۔ عوام کو بڑے پیمانے پر متحرک کرنے کے حوالے سے ان کی مہارت سے انکار کیا جاسکتا ہے نہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حکومت چاہے بھی تو انہیں غیر اہم قرار دے کر نظر انداز نہیں کرسکتی۔ آئندہ عام انتخابات کے حوالے سے بھی حکومت ان کی کوئی بڑی بات نظر انداز نہیں کرسکتی۔

درسی کتب میں تبدیلی کا مطالبہ سب سے پہلے ڈھاکا میں قائم ایک تنظیم حفاظتِ اسلام نے ۲۰۱۳ء میں کیا۔ اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل مفتی فیض اللہ کا کہنا ہے کہ ہم نے درسی کتب میں پائے جانے والے قدرے غیر اسلامی نکات کے بارے میں وزارتِ تعلیم کے اعلیٰ حکام اور حکومتی شخصیات سے بات کی اور انہوں نے بھی ہماری اس رائے سے اتفاق کیا کہ غیر اسلامی نکات درسی کتب کا حصہ نہیں ہونے چاہییں اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے ہمارے مطالبات کی روشنی میں چند ایک ایسی تبدیلیاں کیں جو ناگزیر تھیں۔ مفتی فیض اللہ کا کہنا تھا کہ ہم ان تمام سیاسی جماعتوں کو اس معاملے میں ساتھ ملانا چاہتے ہیں جو عوام میں اپنی جڑیں رکھتی ہیں۔

وزارتِ تعلیم کے ترجمان نے درسی کتب میں کی جانے والی تبدیلیوں اور حمایتِ اسلام کے سیکرٹری جنرل کے بیان پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ دوسری طرف نیشنل کریکلم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین نارائن چندر ساہا کا کہنا ہے کہ درسی کتب میں کی جانے والی تبدیلیاں معمول کا حصہ ہیں اور یہ تبدیلیاں کسی بھی تنظیم یا گروپ کے مطالبے یا دباؤ پر نہیں کی گئیں۔ ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر حمایتِ اسلام یہ کہتی ہے کہ یہ تبدیلیاں اُس کے مطالبے پر کی گئی ہیں تو میں اِس پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا۔

درسی کتب میں کی جانے والی تبدیلیوں پر احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ وزارتِ تعلیم کی مرکزی عمارت کے سامنے سیکڑوں سیکولر طلبہ اور دانشوروں نے احتجاج کیا مگر اب تک اپوزیشن کی جانب سے ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ اپوزیشن کی سب سے بڑی جماعت بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی، جو عام طور پر حکومت کے ہر متنازع اقدام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے، اس معاملے میں ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے بیٹھی ہے۔

ڈھاکا یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کی پروفیسر امینہ محسن کہتی ہیں کہ بظاہر حکمراں جماعت اور اپوزیشن میں اس حوالے سے اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور یوں بھی جمہوریت میں اکثریتی رائے کے سامنے ہتھیار تو ڈالنا ہی پڑتے ہیں۔

بنگلا دیش میں اسلام اور سیکولرازم کے درمیان تناؤ ہر دور میں رہا ہے مگر ۲۰۱۳ء میں یہ تقسیم زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آئی۔ اِس سال مدارس کے ہزاروں طلبہ نے دارالحکومت ڈھاکا کے وسط میں جمع ہوکر مطالبہ کیا کہ الحاد کو فروغ دینے والے بلاگر کو سزا دی جائے، مجسمہ سازی پر پابندی عائد کی جائے اور درسی کتب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ناگزیر نوعیت کی تبدیلیاں کی جائیں۔

حکومت نے مدارس کے مطالبات کا جواب چند اقدامات کے ذریعے دیا۔ ۲۰۱۴ء سے یہ لازم قرار دیا گیا کہ ملک بھر کے دس ہزار سے زائد مدارس آٹھویں جماعت سے حکومت کی تیار کردہ درسی کتب کو بھی اپنے نصاب میں شامل کریں تاکہ مدارس کے طلبہ جدید ترین رجحانات سے آگاہ ہوں اور جب عملی زندگی میں قدم رکھیں تو انہیں کسی بھی حوالے سے زیادہ

الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مدارس کے لیے کتب میں ضروری تبدیلیوں کے حوالے سے فعال کردار ادا کرنے والے ماہر تعلیم صدیق رحمٰن کا کہنا ہے کہ ہم مدارس کے طلبہ کو مرکزی نظام و طریق تعلیم سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے تاکہ مدارس سے نکلنے کے بعد وہ معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں اور اپنے ہی معاشرے میں اجنبی ہو کر نہ رہ جائیں۔ صدیق رحمٰن کہتے ہیں کہ نظریات اور عقائد کا فرق بہت نمایاں ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ معاشرے میں اختلافِ رائے اس قدر نہ ہو کہ سب کچھ ملیامیٹ ہو کر رہ جائے۔ ہماری بھرپور کوشش ہے کہ معاملات کو قابو میں رکھا جائے اور عام آدمی کو مزید الجھن سے بچایا جائے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔

دوسری طرف مدارس سے تعلق رکھنے والے علماء کرام نے حکومت کو چند تحریری تجاویز پیش کیں۔ ایک اہم تجویز یہ تھی کہ درسی کتب میں غیر ضروری طور پر پائے جانے والے غیر اسلامی نام خارج کر دیے جائیں۔ ان کا استدلال تھا کہ توحید پرست معاشرے میں درسی کتب میں کوئی بھی غیر اسلامی نام غیر ضروری طور پر قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ درسی کتب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گفتگو پیش کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔

حکومت نے مدارس کے علماء کرام کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز اور مطالبات کو تسلیم کیا۔ مدارس میں پڑھائی جانے والی درسی کتب سے تمام ہندو، عیسائی اور دیگر غیر اسلامی نام خارج کر دیے گئے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گفتگو بھی کتب سے نکال دی گئی ہے۔ ایسی تمام تصاویر بھی درسی کتب سے نکال دی گئیں جن میں لڑکیوں کو برہنہ سر دکھایا گیا ہے۔ ان کتب پر ٹیکسٹ بک بورڈ کے ہندو چیئرمین، پروفیسر نارائن چندر ساہا، کا نام بھی شائع نہیں کیا جاتا۔ صدیق رحمٰن کہتے ہیں کہ حکومت نے خاصا لچک دار رویہ اختیار کیا۔ یہ اچھا تھا کیونکہ کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔

ٹیکسٹ بک بورڈ کے حکام ابتدائی مرحلے میں درسی کتب سے الحاد پر مبنی ۱۷ نظمیں اور کہانیاں ہٹانے کے لیے تیار نہ تھے۔ مفتی فیض اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے جب یہ دیکھا کہ ٹیکسٹ بک بورڈ والے بات ماننے کو تیار نہیں تو ہم نے وزارتِ تعلیم سے رابطہ کیا۔ وہاں اعلیٰ حکام کو معاملہ سمجھایا اور انہوں نے مزید اعلیٰ سطح پر بات کی۔ یوں درسی کتب میں تبدیلی کی راہ ہموار ہوگئی۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

کم جونگ نام ''وی ایکس'' کا نشانہ کیسے بنے؟

ملائیشیا کا کہنا ہے کہ شمالی کوریا کے سربراہ کم جونگ اُن کے سوتیلے بھائی کم جونگ نام کو اعصاب شکن زہریلے مادے ''وی ایکس'' سے ہلاک کیا گیا۔ اس مادے کو اقوامِ متحدہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے زمرے میں شمار کرتی ہے۔ رینڈ کارپوریشن کے ساتھ کام کرنے والے دفاعی ماہر بروس بینیٹ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وی ایکس مادہ کیسے کام کرتا ہے؟

وی ایکس ایک غیر معمولی تباہ کن کیمیائی ہتھیار ہے اور اس کا ایک قطرہ بھی انسانی جلد پر گرنے سے انسان مر سکتا ہے۔ یہ کیمیکل جلد کے راستے انسانی جسم میں داخل ہو کر نظامِ اعصاب کو تباہ کر دیتا ہے۔ وی ایکس تیل کی طرح کا مادّہ ہے اور عام طور پر پانی میں اچھی طرح حل نہیں ہوتا، جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے حملہ آوروں نے خود کو بچاتے ہوئے کیسے کم جونگ نام کے جسم میں داخل کیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ وی ایکس کو اس طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

سی سی ٹی وی فوٹیج اور پولیس کے بیانات حملے کے منظر کو واضح طور پر بیان نہیں کرتے۔ دو خواتین ان پر حملہ کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ان میں سے کم از کم ایک کپڑے سے کم کا چہرہ بھی پونچھتی ہے۔

ملائیشیا کے تحقیقات کاروں کا کہنا ہے کہ دو خواتین نے اپنے ہاتھوں پر زہریلا مادہ ملا اور پھر ان ہاتھوں سے کم کا چہرہ پونچھ دیا لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ دونوں بھی اسی وقت مر چکی ہوتیں۔ اس لیے اگر کم پر کوئی مائع چھڑکا گیا یا ان کے منہ پر ملا گیا تو غالب امکان یہی ہے کہ کم از کم اس میں وی ایکس نہیں تھا۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ جن خواتین نے کم پر حملہ کیا، وہ ہاتھوں پر مائع لگنے کے باوجود ہلاک نہیں ہوئیں۔ تاہم ہم یہ جانتے ہیں کہ اس حملے کے بعد سے دونوں حملہ آور خواتین میں سے ایک مسلسل الٹیاں کر رہی ہے۔

اس صورتحال میں بظاہر لگتا یہی ہے کہ جس کپڑے سے کم کا چہرہ صاف کیا گیا، اُس پر وی ایکس کی بہت کم مقدار، جو ممکنہ طور پر صرف ایک قطرہ بھی ہو سکتی ہے، موجود تھی۔

لیکن یہ کام کسی بھی طرح آسان نہیں تھا۔ مجرموں نے اس کی مشق کی ہوگی کہ قطرہ کم کو چھوئے لیکن وہ خود اس سے محفوظ رہیں۔

پولیس کا کہنا ہے کہ انھیں یقین ہے کہ مجرموں نے ۱۳ فروری سے پہلے شاپنگ مالز میں اس کام کی مشق کی ہوگی۔

جیسے ہی اس قطرے نے کم جونگ نام کی جلد کو چھوا ہوگا، وہ ان کے نظامِ اعصاب پر اثر انداز ہونا شروع ہوا ہوگا۔ اس سے ایسے ہی اثرات سامنے آتے جو کہ رپورٹ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی کوریا کی حکومت کا خیال ہوگا کہ وہ کم جونگ نام کے جسدِ خاکی پر دعویٰ کر کے پوسٹ مارٹم سے بچ جائیں گے اور بیرونی دنیا کو پتا نہیں چل سکے گا کہ کیا ہوا۔ تاہم ملائیشیا نے پوسٹ مارٹم پر شدید اصرار کیا اور شمالی کوریا اسے روکنے میں ناکام رہا۔ اس تنازع کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ خیال رہے کہ ملائیشیا دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے، جس کے شمالی کوریا کے ساتھ سفارتی تعلقات ہیں۔

تو آخر وی ایکس ملائیشیا کیسے لے جایا گیا ہوگا؟

کسی کو ہلاک کرنے کے لیے اس مادے کی درکار مقدار اس قدر کم ہے کہ اسے کسی قلم یا ایسی چھوٹی سی چیز میں ڈال کر ملک میں لے جایا جا سکتا ہے۔ سکیورٹی حکام کو تب تک اس کے بارے میں پتا نہیں چلا ہوگا، جب تک انھیں اس حوالے سے کوئی مخبری موصول ہوتی اور ظاہر ہے اس معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ وی ایکس کو ملائیشیا میں ہی بنایا گیا ہو۔ یہ ایسی چیز نہیں جو گھر پر بنائی جا سکتی ہو۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ شمالی کوریا نے وی ایکس بنائی تھی یا کسی دیگر ملک سے خریدی تھی۔ وی ایکس کا ایک امریکی اور ایک روسی ورژن ہے اور یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ کون سا ورژن استعمال کیا گیا۔ دونوں ورژن میں فرق کرنے کے لیے ایک پیچیدہ لیبارٹری تجزیہ درکار ہے، اور ممکن ہے کہ یہ اب تک کر بھی لیا گیا ہو۔

وی ایکس ایک انتہائی مستحکم مائع ہے اور تیل کی طرح یہ جلد بخارات میں تبدیل نہیں ہوتا۔ اسی لیے یہ کپڑے پر محفوظ تھا۔

مگر وی ایکس کا اس طرح استعمال عالمی روایات اور قوانین کی سخت خلاف ورزی ہے اور چونکہ اسے ایک غیر ملک میں استعمال کیا گیا، اسی لیے ملائیشیا اور دیگر ممالک اس پر انتہائی نالاں ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ اس سارے معاملے پر چین کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اطلاعات کے مطابق کم جونگ نام کو چین تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

اگر شمالی کوریا نے بین الاقوامی قوانین کی شدید خلاف ورزی کی ہے تو چین کو شمالی کوریا کو کوئلے کی برآمد روکنے سے زیادہ بڑے اقدامات کرنے ہوں گے۔

چین کے پاس موقع ہے کہ وہ شمالی کوریا کو سزا دے کر آئندہ ایسے اقدامات سے روکے کیونکہ چین کے ساتھ تجارتی پابندیاں شمالی کوریا کو شدید مشکلات میں ڈال سکتی ہیں۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''، ۲۴ فروری ۲۰۱۷ء)

بھارت کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب

محمد آصف اقبال، نئی دہلی

بھارت میں ریاستی سطح پر آبادی کے تناسب میں سب سے زیادہ جموں وکشمیر میں ۶۸٫۳۱ فیصد مسلمان آباد ہیں، اس کے برعکس سب سے کم میزورم میں ۲٫۳۵ فیصد مسلمان ہیں۔ دوسری جانب آسام، مغربی بنگال اور کیرالہ میں ۲۵ فیصد سے زائد مسلمان موجود ہیں۔ وہیں ۱۵ سے ۲۰ فیصد والی ریاستیں بہار اور اتر پردیش ہیں، وہ ریاستیں جن میں ۱۰ سے ۱۵ فیصد مسلمان رہتے ہیں، اُن میں جھارکھنڈ، اتراکھنڈ، کرناٹک، دہلی اور مہاراشٹر شامل ہیں۔ لکش دیپ جو بھارت کا حصہ ہے وہاں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ بلکہ کہا جائے کہ لکش دیپ، بھارت کا مکمل طور پر مسلم اکثریتی علاقہ ہے تو غلط نہیں ہوگا، جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۹۶٫۵۸ ہے۔ مزید آٹھ ریاستیں ایسی ہیں جہاں آبادی کے تناسب سے مسلمان ۸ سے ۱۰ فیصد کے درمیان رہتے ہیں۔ وہیں اگر ان اعداد وشمار کا جائزہ اس لحاظ سے لیا جائے کہ بھارت میں موجود مسلمانوں کی کل آبادی کا حصہ کون سی ریاست میں کس حیثیت میں موجود ہے، تو اس موقع پر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں ۱۷ کروڑ ۲۲ لاکھ ۴۵ ہزار ۱۵۸ مسلمان شمار کیے گئے ہیں، جو بھارت کی آبادی کا ۱۴٫۲۲ فیصد حصہ ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ مسلم اکثریتی علاقہ لکش دیپ بھارت میں مسلمانوں کی کل آبادی کا آدھا فیصد بھی نہیں، بلکہ یہ تعداد ۰٫۰۴ ہی شمار کی جاتی ہے۔ کیونکہ لکش دیپ میں کل آبادی ۶۴,۴۷۳ ہے، جس میں ۶۲,۲۶۸ مسلمان ہیں۔ یعنی یہاں گرچہ مسلمان اکثریت میں ہیں، اس کے باوجود بھارتی وسائل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ کل آبادی کے تناسب میں ان کی حقیقی تعداد بھی ہے۔ وہیں ۶۸٫۳۱ فیصد مسلمانوں کی آبادی جموں وکشمیر میں موجود ہے، وہ بھی مسلمانوں کی کل آبادی کے اعتبار سے ۹۷٫۴ ہے۔ مزید یہ کہ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے مسائل جس قدر بڑی تعداد میں موجود ہیں، وہ انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں فراہم کرتے کہ وہ مرکزی دھارے سے وابستہ مسائل میں دلچسپی لیں یا اس میں حصہ داری نبھائیں۔ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی بڑی تعداد علیحدگی پسندوں پر محیط ہے۔ لہٰذا ستّر سالہ دورِ آزادی کے باوجود جموں وکشمیر کے مسلمان بھارتی مسلمانوں کے مسائل، بھارتی سماج کے عمومی مسائل اور درپیش چیلنجوں میں کسی بھی حیثیت میں کوئی کردار ادا نہیں کر پائے ہیں اور یہ صورتحال آج بھی برقرار ہے۔ اس کے باوجود کہ وہاں بے شمار جانیں علیحدگی کے لیے قربان کی جا چکی ہیں، لیکن یہ مسئلہ کیونکہ ملک کی سالمیت کا اہم ترین مسئلہ ہے، اس لیے یہ مسئلہ کسی بھی صورت حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ چونکہ ہمارا یہ مضمون جموں وکشمیر کے مسائل پر نہیں لکھا جا رہا ہے، لہٰذا اِس موضوع کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے، مسلمانوں کی کل آبادی کے تناسب میں کس ریاست میں مسلمان کتنے فیصد میں رہتے ہیں، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

دارالحکومت دہلی میں ریاستی سطح پر موجود آبادی کا ۱۲٫۶۸ فیصد حصہ مسلمان ہیں، وہیں دہلی سے متصل ریاست ہریانہ میں ۷٫۰۳ فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان آبادیوں کو ملکی سطح پر موجود مسلمانوں کی آبادی کے تناسب میں دیکھا جائے تو یہ دونوں ہی ریاستیں ایسی ہیں جہاں ۵٫۱ فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ ریاست ہریانہ میں مسلمانوں کی آبادی کو ریاستی سطح پر حد درجہ کم تصور کیا جاتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ ایک زمانے میں یہاں مسلمانوں کا قتل عام تھا، تو وہیں ان کا مرتد ہونا اُس سے بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس کے باوجود ہریانہ میں ۱۷ لاکھ ۸۱ ہزار مسلمان رہتے ہیں۔

۲ سے ۵ فیصد والی مسلم آبادی کا تناسب رکھنے والی ریاستیں ۸ ہیں، ان میں ریاست جموں وکشمیر، جھارکھنڈ، کرناٹک، گجرات، آندھرا پردیش (۲۰۱۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں، جبکہ ریاست تلنگانہ اور آندھرا، ایک تھے) راجستھان، مدھیہ پردیش اور تمل ناڈو شمار کی جاتی ہیں۔ ۳ ریاستیں ایسی ہیں جہاں کل مسلم آبادی کا تناسب ۵ سے ۱۰ فیصد موجود ہے۔ یہ ریاستیں آسام، کیرالہ اور مہاراشٹر ہیں۔ دوسری جانب ۲ ریاستیں ایسی بھی ہیں جہاں مسلمان اپنی کُل آبادی کے تناسب میں سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں ریاست مغربی بنگال اور بہار شمار کی جاتی ہیں، یہاں مسلمان اپنی کل آبادی کے لحاظ سے ۱۰ سے ۱۵ فیصد موجود ہیں۔ دیگر وہ ریاستیں ہیں جہاں مسلمان اپنی کُل آبادی کے لحاظ سے ایک فیصد سے بھی کم تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں اتراکھنڈ بھی آتا ہے۔ منی پور، ہماچل پردیش، پنجاب اور گوا بھی۔ اس پورے تجزیہ میں ریاست اتر پردیش کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ بات عجیب وغریب ہوگی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ریاست اتر پردیش بھارت کی وہ واحد ریاست ہے، جہاں مسلمانوں کی کل آبادی کا ۲۲٫۳۴ فیصد حصہ ہے۔ ۳ کروڑ ۸۴ لاکھ ۸۳ ہزار ۹۶۷ مسلمانوں کی آبادی والی ریاست نہ صرف بھارت کے تناظر میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے بلکہ ریاست کی آبادی کو دنیا میں موجود مسلمانوں کی کل آبادی کے تناسب میں دیکھا جائے تو بھی اس کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔ پوری دنیا میں فی الوقت ایک سو پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں، اِن میں تقریباً ۴ کروڑ مسلمان بھارت کی ریاست اتر پردیش میں رہتے ہیں، یہ دنیا کی کل مسلم آبادی کا ۳٫۵۲ فیصد حصہ ہیں۔

اتر پردیش بھارت میں ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ بھارت کی آزادی سے قبل اور بعد میں ملک کی باگ ڈور میں اس ریاست کا اہم ترین کردار رہا ہے۔ زیادہ تر صدور اور وزرائے اعظم اسی ریاست کی دَین ہیں۔ وہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اہم ترین دینی ومذہبی تعلیمی ادارے یہیں موجود ہیں۔ ملکی مسائل ہوں یا سماج اور مذہبی بنیادوں پر موجود لوگوں کے مسائل، وہ بھی اسی ریاست کی دَین ہے۔ بھارت میں آزادی سے قبل اور بعد میں مسلمانوں کی اعلیٰ قیادت ریاست اتر پردیش سے ہی حاصل ہوتی رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قیادت، مسائل میں اس قدر الجھی رہی یا اس کو الجھائے رکھا گیا کہ مسائل کم ہونے کے بجائے ہر دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کی آزادی کی تحریک بھی اتر پردیش سے ہی شروع ہو کر انجام تک پہنچی۔ نیز پاکستان کی تعمیر وترقی سے لے کر توسیع تک اس ریاست کے مسلمانوں نے اہم کردار انجام دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی خوب عیاں ہے کہ بھارت کے مسلمان جن بڑے مسائل سے آج تک دوچار ہوئے ہیں اور جس کے اثرات پورے ملک پر مرتب ہوئے، اس میں بڑا کردار ادا کرنے والی یہی ریاست اتر پردیش ہے۔ پھر یہ سانحہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے کہ ریاست اتر پردیش کے مسائل ہی نے ملک کی سیاست اور اس سے متعلقہ ایشوز کو کسی کے لیے مثبت تو کسی کے لیے منفی بنا دیا، انہیں مسائل کی بنا پر کسی کو عروج حاصل ہوا تو کوئی تنزل کا شکار ہو گیا، اور ہزار جتن کرنے کے باوجود آج تک اُٹھ نہیں سکا۔ لیکن افسوس اور حد درجہ افسوس کہ یہ سب کھیل تماشہ اُسی ریاست کی اکثریتی اور اقلیتی آبادی کو مہرا بنا کر کل بھی کھیلا جاتا رہا ہے اور آج بھی جاری ہے!

|||

پاکستان: دھماکوں کی موجودہ لہر کا مقصد

ڈاکٹر عاصم اللہ بخش

پاکستان کو پچھلے قدموں پر ڈالنا اور اس کے قومی اہداف کا راستہ روکنا۔ اس کے لیے پاکستان میں دہشت، مایوسی اور اندرونی چپقلش کو فروغ دینا، اہم سنگ ہائے میل ہیں۔

یہ نہ تو الہ ٹپ ہے اور نہ ہی عارضی۔ بظاہر یہ ایک نئی جنگ کا آغاز ہے۔ اس کا پہلا اور بنیادی ہدف سی پیک ہے۔ ہم سی پیک پر لاکھ باتیں بناتے رہیں، دشمن کو اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہے۔ بھارت کا یہ خیال ہے کہ سی پیک کی تکمیل سے وہ دفاعی اور سفارتی لحاظ سے گھر جائے گا، اور تجارتی اعتبار سے الگ تھلگ ہو جائے گا، کیونکہ اس کے اور وسط ایشیائی منڈیوں کے بیچ ایک مستقل رکاوٹ سامنے آسکتی ہے۔

دوسری جانب۔ ایران کے متعلق بھی اسے تشویش ہو چلی ہے کیونکہ یمن جنگ میں امریکا کی براہ راست شمولیت اور صدر ٹرمپ کے معاندانہ پالیسی بیانات کے بعد ایران کا روس و چین اتحاد کی طرف مکمل طور سے جھک جانا بعید از قیاس نہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ چاہ بہار کو گوادر کے مقابل لانے کے بجائے اس کے پارٹنر کا درجہ دے کر سی پیک میں شامل ہو سکتا ہے۔

سفارتی سطح پر بھارت کو پہلے ہی چین سے بہت شکایات ہیں کیونکہ اس نے نہ صرف این ایس جی میں بھارت کی شمولیت پر غیر لچکدار مؤقف اپنا رکھا ہے بلکہ وہ پاکستان کی خاطر (ایک فرد تک کے لیے بھی) سلامتی کونسل میں اپنا ویٹو کا حق استعمال کرنے کو آمادہ رہتا ہے۔

اگر سی پیک واقعی شرمندہ تعبیر ہو جاتا ہے تو پھر چین اور پاکستان مشترک مفاد کی ڈور مزید مضبوط ہو جائے گی، جس میں بھارت خود کو الجھتا محسوس کر رہا ہے۔ یہ بھارت کے علاقائی اور عالمی عزائم کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا۔ یہی نہیں، افغانستان کے حوالے سے چین، روس، پاکستان اور ایران کے مابین کسی درجہ تعاون کے بات بھی بھارت کے لیے ایک ڈراؤنا امکان ہے۔ بھارت کے پاس افغانستان کی سرزمین ایک ایسا انمول ہتھیار رہے، جس سے وہ خود سامنے آئے بغیر جب چاہے پاکستان کو زک پہنچا سکتا ہے۔ تاہم، بھارت کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اسے جو کچھ کرنا ہے ۲۰۱۷ء کے دوران ہی کرنا ہے۔ اگر ایک بار سی پیک کے فلیگ شپ منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچنے لگے تو پھر معاملات ہاتھ سے نکل جائیں گے، کیونکہ پھر چینی مفادات کو ضرب کا مطلب چین سے براہِ راست مخاصمت ہے، جس کا بھارت اس وقت متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس لیے بھارت اس وقت وہ سب کچھ کرے گا جو وہ کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے لیے سب برائیوں کی جڑ یہی سی پیک ہے، یہاں تک کہ ایک کھلی جنگ بھی۔ لیکن آخر الذکر ایک بہت بڑا جوا ہوگا۔ وہ اس جوئے تک جائے گا ضرور لیکن صرف اس صورت اگر پلان اے فیل ہو گیا۔ پلان اے وہی ہے جس پر بھارت ٹی ٹی پی اور بی ایل اے وغیرہ کی مدد سے پہلے ہی سرگرم چلا آرہا ہے۔ بھارت پوری شدومد کے ساتھ ایک بار پھر پراکسی اور نفسیاتی جنگ کا محاذ گرم کرے گا اور ہر وہ حربہ اپنائے گا، جس سے وہ پاکستان کو شکست خوردگی کا شکار کر سکے اور اس کا بین الاقوامی تاثر خراب سے خراب تر کر سکے۔ یاد رہے کہ شکست خوردگی کے لیے شکست کا ہو جانا لازم نہیں لیکن اس کا اثر اور نقصان اصل شکست سے کم نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں ۱۰ جنوری ۲۰۱۷ء کو قندھار میں ہونے والا بم دھماکا نہایت اہمیت کا حامل ہے اور ماہرین اسے انٹیلی ایجنسی کا انڈر کور آپریشن قرار دے رہے ہیں۔ اس میں متحدہ عرب امارات کے ۵ سفارتکار مارے گئے اور اس واقعہ میں زخمی اماراتی سفیر بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ بظاہر اس حملہ کا مقصد یہ تھا کہ اسے طالبان کے اثر والے علاقے میں طالبان حملہ آوروں کے ہاتھوں امارات کے لوگوں کا قتل دکھایا جا سکے۔ چونکہ افغان طالبان پاکستان کے کہنے پر چلتے ہیں (بقول افغان وبھارتی حکام) اس لیے اس میں پاکستان کا ہاتھ ثابت کر کے دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیوں کو ہوا دی جا سکے۔ گو طالبان نے اس واقعہ سے لاتعلقی کا اظہار کیا لیکن حکام نے بہ اصرار اسے طالبان/ پاکستان کے ذمہ لگایا۔ اس تناظر میں پاکستان کے حوالے سے آنے والے دن کافی صبر آزما ہو سکتے ہیں۔

مثلاً، چند سامنے دکھائی دینے والے اہداف میں پی ایس ایل کا فائنل لاہور میں ہونے سے روکنا ہے۔ بم دھماکا ہو چکا، اگر اصرار جاری رہا تو دوسری قسط آنے کا بھی امکان ہے۔ اس ضمن میں اے پی ایس اور باچا خان یونیورسٹی جیسی واردات بھی خارج از امکان نہیں۔

اس کے علاوہ جو اہم ترین ہدف ہو سکتا ہے، وہ ہے مردم شماری۔ مردم شماری ایک نہایت اہم پراجیکٹ ہے۔ انسداد دہشت گردی کا کوئی بھی پلان آبادی اور عوامی محل وقوع کے درست اعداد و شمار کے بغیر ممکن نہیں۔ پیرس، برسلز اور جرمنی وغیرہ میں اسی کی بنیاد پر مجرموں کا فوری پتا لگا لیا گیا۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ بغیر اس ڈیٹا کے انسداد دہشت گردی کا ہر منصوبہ محض منصوبہ ہی ہے۔ اسے آپ دہشت گردی کے خلاف ایک اور آپریشن ہی سمجھیں، اہم ترین آپریشن۔ اس کی ناکامی یا منسوخی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ہر دو اطراف کے لیے۔ اس کے بعد ۲۳ مارچ کی پریڈ کی منسوخی ایک ہدف ہے، اور پھر روس کے ساتھ گیس پائپ لائن۔

بھارت کو جو ایڈوانٹیج حاصل ہے، وہ معمولی نہیں۔ وہ بغیر سامنے آئے ایک دوسرے ملک کی زمین، پاکستان سے تعلق رکھنے والی افرادی قوت، اپنے وسائل اور امریکا کی آشیر باد سے بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نیز اسے توقع رہتی ہے کہ پاکستانی معاشرے کی پیچیدگیاں اور میڈیا کی بچگانہ آزادی اس کے لیے Multiplier Force کا کام کریں گی۔ نفسیاتی جنگ میں سنٹرل اتھارٹی کو زک پہنچانا اہم ہوتا ہے۔ پاکستان میں یہ پوزیشن حکومت کے ساتھ ساتھ فوج کو بھی حاصل ہے اور وہ جانتا ہے کہ پاکستان میں ہڑبونگ کا رسیا میڈیا کس طرح اس کا کام آسان کر سکتا ہے۔ اپنے میڈیا کو وہ ۲۹ ستمبر ۲۰۱۶ء کی مبینہ سرجیکل اسٹرائیکس کے ہنگام ٹیسٹ کر چکا اور اس کی جانب سے اسے مکمل اطمینان ہے۔

آخر میں یہ بات کہ کیا کرنا ہوگا۔ ۲۰۰۱ء کے بعد دنیا واقعی بدل گئی ہے، اور جنگیں بھی۔ اب یہ معاملہ کچھوا اور خرگوش کی دوڑ والا ہے اور کچھوا بننے میں ہی حقیقی کامیابی ہے۔ جہد مسلسل، لامتناہی۔ ہم نے دیکھا کہ جس نے بھی خرگوش کی طرح فتح کے اعلان میں عجلت کی، اس نے اپنے لیے گڑھا کھود لیا۔ افغان طالبان اور عراق کے حوالے سے امریکا کی مثال ہمارے سامنے

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی زیرِ طبع نئی کتاب

"را" اور بنگلا دیش

(زیرِ طبع)

محمد زین العابدین

اکیڈمی بک سینٹر

D-35، بلاک۔5، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

فون: 021-36809201

ہے۔ اس جنگ میں کامیابی صرف یہ ہے کہ آپ کا اندرونی سکیورٹی اور سیاسی نظام کس قدر ٹھوس ہے۔ وہ جتنا قابل بھروسا ہوگا، پر اکسی وار مسلط کرنے والے کی کوشش اور حوصلہ، دونوں ہی ناکامی سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ ماہرین غذا کہتے ہیں کہ موٹاپا ختم کرنے کے لیے ڈائٹنگ صرف وقتی افاقہ کا باعث ہوسکتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو یہ ایک خودفریبی ثابت ہوتی ہے کہ اسے ترک کرنے کے بعد وزن پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ وزن مستقل کم کرنا ہے تو پھر طرزِ زندگی بدلنا ہوگا۔ یعنی جو غذائی تبدیلی ہو پھر بقیہ تمام عمر اسی پر بسر ہو۔

یہی مثال انسداد دہشت گردی کی ہے۔ اسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہے تو مستقل اور طویل المعیاد (اسٹریٹجک) اقدامات لینا ہوں گے۔ طرزِ زندگی بدلنا ہوگا، طرزِ حکومت بدلنا ہوگا۔۔۔ ریاست کے انتظامی اور امن عامہ کے نظام کو ایک نیا اور ابدی رنگ دینا ہوگا۔

اب تک یہ دوڑ سو میں سے سو دفعہ کچھوا ہی جیتا ہے۔ خرگوش بننے کی کوشش خودکشی ہے۔

(بحوالہ: ''دیلیل ڈاٹ پی کے''۔ ۱۶ر فروری ۲۰۱۷ء)

بقیہ: مشرقِ وسطیٰ کے تیل کی حفاظت اور امریکا

ہرگز نہیں۔ ایسا کرنے کی کوشش میں ایران کو سخت دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا، جس کی وہ اس وقت تاب نہیں لاسکتا۔

ایک اور ڈراؤنا خواب یہ ہے کہ ایک اہم عرب ملک کی آمرانہ حکومت کسی غیر معمولی انقلاب کی زد میں آکر گر جائے۔ تاہم امریکی فوج کی موجودگی میں ایسا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مزید یہ کہ اس عرب ملک میں عوامی بغاوت برپا کرنے کے لیے کسی بیرونی طاقت کی شہ اور فوجی امداد چاہیے، مگر فی الحال اس کا بھی امکان نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا کے لیے ضروری ہے کہ وہ بتدریج مشرقِ وسطیٰ سے اپنے دستے نکالے کیونکہ یورپ اور ڈیگو گارشیا میں موجود امریکی طیارے کسی بھی مہم جوئی کا تدارک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آخر میں، امریکا کے لیے ضروری ہے کہ وہ روس، چین اور بھارت سے مذاکرات کرے تاکہ باہمی مفادات کو طے کرتے ہوئے تیل کے وسائل کو محفوظ بنایا جاسکے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Does the U.S. military actually protect Middle East Oil?".
("nationalinterest.com". January 9, 2017)

I I I

ٹرمپ اور اسرائیل: خطرناک ملاپ!

اسرائیلی وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس کا سب سے خطرناک پہلو یہ نہیں تھا کہ انہوں نے دو ریاستوں پر مبنی حل کو ترک کردیا بلکہ خطرناک پہلو یہ تھا کہ انہوں نے انتہائی بے پروائی، لاتعلقی اور غیر ذمہ داری اپناتے ہوئے اس نظریے سے دستبرداری اختیار کی۔ ان کا تمسخرانہ لب و لہجہ، ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور متعلقہ مسئلے سے ان کی عیاں صَرف نظر انتہائی خطرناک نوعیت کی حامل تھی۔ انہوں نے کہا ''میں دو ریاستوں پر مبنی حل کے علاوہ یک ریاستی حل کی طرف بھی دیکھ رہا ہوں اور مجھے وہ حل پسند ہے جسے دونوں فریق پسند کرتے ہیں''۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے یہ اہم حقیقت نظر انداز کردی کہ کس طرح اسرائیلی اور فلسطینی ایک قابل عمل مذاکرات پر تیار ہوں گے۔

اس امر میں شک ہے کہ ان کے یہ الفاظ ان کی سوچی سمجھی حکمت عملی کے عکاس ہیں۔ یہ امر بھی غیر یقینی ہے کہ ان کے یہ الفاظ ان کے عزائم کے ترجمان ہیں۔ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر کا کہنا ہے کہ امریکا ابھی تک دو ریاستوں پر مبنی حل کی حمایت کرتا ہے لیکن کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ نے اسرائیلی غیر قانونی بستیوں کے علاوہ امریکی سفارتخانے کی منتقلی کے متعلق بھی مبہم پیغام بھیجا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر ٹرمپ انتظامیہ کی پالیسی، پریشان کن ہے۔ ٹرمپ کی طرف سے اسرائیل کے لیے نامزد امریکی سفیر ڈیوڈ فرائیڈمین، غیر قانونی بستیوں کی مالی امداد کرچکے ہیں، انہوں نے مغربی کنارے میں اسرائیل کی طرف سے فلسطینی علاقے ہتھیانے کی بھی حمایت کی، نیز انہوں نے تسلسل سے روشن خیال یہودیوں کے متعلق حقارت آمیز بیانات دیے ہیں، اگرچہ بعدازاں انہوں نے معذرت طلب کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹرمپ کی طرف سے حقائق سے بے خبری بھی بہت خطرناک ہے۔ اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹرمپ کے الفاظ امریکی پالیسی کے غماز ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم نے دو ریاستوں پر مبنی حل کے متعلق زبانی حمایت کا اظہار کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جان کیری نے اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن معاہدے کے قیام کے لیے سرتوڑ کوشش کی، تاکہ آنے والی نئی انتظامیہ اس صورتحال کو تحلیل نہ کرسکے۔ جغرافیائی اور سیاسی حالات گواہ ہیں کہ واحد ریاست پر مبنی حل نہ تو یہودی اور نہ ہی جمہوری ہوسکتا ہے۔ یہ صورتحال اس امر کی بھی عکاس ہوگی کہ فلسطینیوں کو مستقل طور پر دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت حاصل ہوجائے گی اور یہ نظریہ نہ صرف فلسطینیوں سے غداری ہے بلکہ اسرائیل کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ نظریہ غلط ہوگا اور تباہ کن بھی ہوگا۔ دو مختلف قسم کے افراد، ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور مستقبل میں ان کے اکٹھا ہونے کی کوئی امید نہیں۔

یہ کہنا غیر معمولی نوعیت کا حامل ہوگا کہ جس طرح یا ہونے کہا کہ ٹرمپ یہودیوں کے بہت بڑے حمایتی ہیں۔ ٹرمپ کی فتح کے بعد جب ان سے پوچھا گیا کہ موجودہ دور میں نفرت پر مبنی جرائم میں اضافہ اور پھر یہ کہ ان کی انتظامیہ نسل پرست اور غیر ملکیوں سے نفرت پر مبنی رویہ اپنا رہی ہے، کے متعلق ان کی کیا رائے ہے تو صدر نے antisemitism کی مذمت کرنے سے انکار کردیا اور اپنی انتخابی فتح کے متعلق لایعنی باتیں کیں۔

اس صورتحال کا پیشگی ادراک کرتے ہوئے بین الاقوامی برادری نے پہلے تو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اسرائیل مخالف قرارداد منظور کی اور بعدازاں پیرس کانفرنس منعقد کی کہ دو ریاستوں پر مبنی حل میں جان ڈالی جائے، لیکن ٹرمپ قرارداد کے علاوہ اس کانفرنس کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ لیکن اقوام متحدہ کی اس قرارداد نے کم از کم بین الاقوامی قانون کے نفاذ کی طرف راستہ دکھایا۔

اقوام متحدہ اور عرب لیگ نے متنبہ کیا ہے کہ دو ریاستوں پر مبنی حل کا کوئی متبادل نہیں اور یورپی یونین کو بھی اس ضمن میں واضح پیغام بھیجنا چاہیے۔ جرمنی کی چانسلر انجیلا مرکل نے بنجمن یاہو کے ساتھ ملاقات منسوخ کردی ہے، اور ان کا یہ طرزِ عمل، اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کی زمین ہتھیانے پر مبنی حکمت عملی کے خلاف ناراضی کا اظہار ہے۔ نیز ان کا یہ طرزِ عمل ایک ایسی اچھی مثال ہے کہ کس طرح عالمی قائدین معاملے کی حساس نوعیت کو محسوس کرسکتے ہیں، لیکن برطانوی وزیراعظم تھریسامے کا طرزِ عمل درست نہیں کہ انہوں نے جان کیری کی طرف سے شروع کی گئی کوششوں کو نیچا دکھادیا ہے اور یقیناً اب وقت کا تقاضا ہے کہ کسی بھی تذبذب کے بغیر برطانیہ کی طرف سے دو ریاستوں پر مبنی حل کی حمایت سامنے آنی چاہیے۔

"The Guardian view on Trump and Israel: casual, careless and dangerou".
("The Guardian". Feb. 16, 2017)

مستقبل کی افغان ریاست اور طالبان

پانچویں قسط

فی زمانہ اقتدار میں شراکت

طالبان کا سیاسی ونگ کہتا ہے کہ اب حالات بہت مختلف ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ طالبان بارگیننگ پوزیشن میں نہیں رہے، اس لیے اپنے موقف سے ہٹ رہے ہیں۔ اگر طالبان اب بھی عسکری فتح سے ہمکنار ہوں تب بھی سیاسی اجارہ داری قائم کرنا کسی بھی قرینِ دانش نہ ہوگا کیونکہ ایسا کرنے سے صرف خرابیاں پیدا ہوں گی، معاملات مزید الجھیں گے۔ فی زمانہ سب کو ساتھ لے کر چلنے کی حکمتِ عملی ہی بہترین آپشن ہے۔

بی کے کہتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں طالبان قائدین کی اکثریت سیاسی اجارہ داری کے حق میں تھی مگر اب ایسا نہیں۔ فی زمانہ سیاسی اجارہ داری کے حق میں بولنے والے خال خال ہیں۔ طالبان قیادت سے تعلق رکھنے والی بیشتر شخصیات اس نتیجے تک پہنچ چکی ہیں کہ وسیع البنیاد حکومت اور جامع ریاستی ڈھانچا تشکیل دینے کے لیے معاشرے کے تمام طبقات، جماعتوں اور گروپس کو ساتھ لے کر چلنا پڑے گا۔

غیر ملکی افواج اور افغان فورسز سے لڑنے والے طالبان کی رائے بہت مختلف ہے اور ان کے پاس اختلاف کی ٹھوس وجوہ بھی ہیں۔ سب سے ٹھوس وجہ تو یہی ہے کہ انہوں نے جان و مال کی قربانی دی ہے، بربادی کا سامنا کیا ہے۔ بی ایس کہتے ہیں کہ ابھی تک ہتھیار اٹھائے ہوئے بیرونی اور قومی فوج سے لڑنے والوں کی رائے خواہ کچھ ہو، طالبان کا سیاسی ونگ اب واضح طور پر یہ چاہتا ہے کہ سب کو ساتھ لے کر چلے تاکہ حقیقی امن کی راہ ہموار ہو اور ملک میں وہ استحکام آئے جس کے لیے لوگ تقریباً چار عشروں سے ترس رہے ہیں۔ جب طالبان کا قیام عمل میں آیا تھا تب نوجوانوں میں بہت جوش و جذبہ تھا۔ طالبان میں شمولیت اختیار کرنے والے نوجوانوں نے سن رکھا تھا کہ ایک سپر پاور کو مجاہدین نے مار بھگایا، بلکہ شکست و ریخت سے دوچار کردیا۔ ان کی بھی خواہش تھی کہ ایک سپر پاور سے نبرد آزما ہوں۔ جب امریکا نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر افغانستان پر حملہ کیا تو طالبان میں شامل نوجوانوں میں غیر معمولی جوش و جذبہ تھا۔ وہ ایک سپر پاور اس کے اتحادیوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہتے تھے۔ ملا عمر نے بھی اس بات پر زور دیا کہ جنہوں نے اسلامی امارت ختم کی ہے، انہیں بھرپور مزا چکھایا جائے۔ ابتدا میں سب کو یقین تھا کہ یہ جنگ جلد ختم ہوجائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ پھر جب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ جنگ یا تو جلد ختم نہیں ہوگی یا پھر بہت طویل مدت تک چلتی رہے گی تب یہ طے کیا گیا کہ مصالحت کی راہ پر گامزن ہوا جائے۔ طالبان قیادت اس بات سے ڈر رہی تھی کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جنگ کہیں فتنہ نہ بن جائے یعنی مسلمان آپس ہی میں دست بہ گریباں ہوتے رہیں۔

طالبان قیادت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دشمنوں کو نہ تو مکمل طور پر ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان پر حتمی نوعیت کی فتح پائی جاسکتی ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ لڑائی ختم کرکے امن کی راہ تلاش کی جائے۔ مصالحت کی راہ پر گامزن ہوکر سب کو امن اور استحکام کے پلیٹ فارم پر آنے کی تحریک دی جاسکتی ہے۔ اگر ہر فریق اپنے موقف پر اڑا رہے اور اپنی کسی بھی بات سے سرِمُو انحراف کرنے سے صاف انکار کردے تو امن اور استحکام کی راہ کسی طور ہموار نہیں ہوسکتی۔

ایل ایم کی رائے یہ ہے کہ طالبان قیادت کو اب اچھی طرح احساس ہوچکا ہے کہ سیاسی اجارہ خود اس کے لیے اور ریاست کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ سوویت افواج کے انخلا کے بعد مجاہدین کے ہر گروپ نے اپنے طور پر یعنی تن تنہا حکومت بنانے کی کوشش کی اور ناکامی سے دوچار ہوا۔ اس کے نتیجے میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ مجاہدین میں اختلافات کے باعث دوسروں کو قبول کرنے سے گریز کو رجحان کا درجہ ملتا گیا۔ سوویت یونین کو ملک سے نکالنے میں گلبدین حکمت یار نے کلیدی کردار ادا کیا تھا مگر جب سوویت افواج کا انخلا مکمل ہوگیا تو وہ اقتدار میں شراکت کے حوالے سے الجھ گئے اور ملک میں مزید عدم استحکام پیدا ہوا۔ اگر سوویت افواج کو نکال باہر کرنے والے مجاہدین مل کر رہتے تو طالبان کے پیدا ہونے یا پنپنے کی گنجائش بھی پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

حامد کرزئی نے اقتدار سنبھالا تب بھی یہی مسئلہ پیدا ہوا۔ انہوں نے دوسروں کو اقتدار میں شریک کرنے سے گریز کی راہ پر گامزن رہنا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خرابیاں بڑھتی گئیں اور ملک بھر میں لڑائی ختم ہونے کی منزل سے دور رہی۔ اور اب اشرف غنی بھی اِسی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ بھی اقتدار میں شراکت پر زیادہ یقین کے حامل نہیں۔ انہوں نے اپنے نزدیک ترین حریف عبداللہ عبداللہ کو اقتدار میں بھرپور انداز سے شریک کرنے سے یکسر گریز کیا ہے۔ افغانستان میں اب تک کسی بھی جماعت یا گروپ کے لیے تنہا حکومت بنانا ممکن نہیں رہا۔ اگر کوئی گروپ ایسا کرتا ہے تو اس کا اقتدار کابل اور اس کے مضافات تک محدود رہتا ہے۔ اب طالبان قیادت اس رائے کے ساتھ سامنے آئی ہے کہ مستحکم نظام حکومت اور مستحکم تر ریاستی ڈھانچے کے لیے تمام جماعتوں، طبقات اور گروپوں کی نمائندگی والی حکومت کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے۔

افغان بحران کے فریقین سے طالبان کی گفت و شنید

وائی ایم نے بتایا کہ طالبان نے بعض مخالف گروپوں سے گفت و شنید کا آغاز کردیا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں جو دشمن تھے انہیں طالبان اب قبول کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تو شمالی اتحاد کے سرکردہ رہنما عبداللہ عبداللہ کو گلے لگایا جارہا ہے اور دوسری طرف یونس قانونی کو بھی قبول کیا جارہا ہے۔ محمد قاسم فہیم مرحوم کے علاوہ سابق مجاہد رہنما محمد محقق اور عبدالرب رسول سیاف سے روابط بڑھانے میں بھی الجھن محسوس نہیں کی جارہی۔ بائیں بازو کے لوگوں میں سے نورالحق علومی اور حنیف اتمار سے رابطہ کرنے کو بھی طالبان نے ضروری سمجھا ہے۔

۲۰۱۲ء میں طالبان نے روابط کا آغاز کیا۔ اس کا بنیادی مقصد افغانستان سے مکمل امریکی انخلا کے بعد کی صورت حال کے لیے تیاری کرنا تھا۔ جن شخصیات سے طالبان نے رابطے کرکے بات چیت کی ان میں سے کوئی بھی کسی حکومتی منصب پر فائز نہ تھا۔ طالبان دراصل یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ طاقت کے ریاستی اور غیر ریاستی مراکز میں واضح فرق سمجھتے ہیں۔

ایل ایم نے بتایا کہ جب روابط استوار ہوئے اور گفت و شنید کا مرحلہ شروع ہوا تو بہت سے طالبان رہنماؤں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے ابتدا ہی سے دوسروں کو غلط سمجھا۔ روابط بہت احتیاط کے ساتھ شروع ہوئے۔ دسمبر ۲۰۱۲ء میں فرانس اور قطر میں طالبان نے افغانستان کے کئی سرکردہ سیاست دانوں سے ملاقات کی تاکہ مستقبل کے افغانستان کے بارے میں کھل کر بات کرنا ممکن ہو۔

ڈی ایف کا کہنا ہے کہ ملا عمر نے دشمنوں اور حریفوں سے رابطوں کے لیے گرین سگنل دے دیا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا نظام چاہتے تھے جس میں سب شریک ہوں۔ بی کے نے بتایا کہ طالبان کی سیاسی کمیٹی نے بھی سرکردہ شخصیات سے روابط شروع کردیے تھے۔ ۲۰۱۵ء کے موسم گرما سے رابطے تھم گئے

ہیں جب ملا اختر محمد منصور نے ملا عمر کی موت کا باضابطہ اعلان ہوجانے کے بعد تحریکِ طالبان کا امیر بننے کی کوشش کی۔

اس وقت بنیادی سوال یہ ہے کہ تحریکِ طالبان کا سیاسی ونگ جو کچھ کررہا ہے کیا وہ ان لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگا جو طالبان کی طرف سے اب تک افغانستان کی فوج اور بیرونی افواج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ فیلڈ کمانڈرز سیاسی ونگ کی کسی بھی کامیابی کو قبول کریں گے یا نہیں، یہ سوال بہت اہم ہے۔ جن شخصیات کا انٹرویو کیا گیا انہوں نے بتایا کہ ماضی میں فیلڈ کمانڈرز نے سیاسی فیصلوں کو دل کی گہرائی سے قبول کیا ہے۔ سی ایچ کے الفاظ میں بعض کمانڈرز اور لڑنے والے عام طالبان ارکان اسلامی امارت کی بحالی چاہتے ہیں۔ ان کا یہ وژن بہت پختہ ہے۔ اس سے کم پر وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ تحریک طالبان کی قیادت ایک عشرے سے پاکستان اور خلیجی ممالک میں پرسکون اور پرآسائش زندگی بسر کررہی ہے۔ ایسے میں سوچا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے طالبان کی طرف سے لڑتے ہوئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا وہ ایسی آسانی سے کیونکر مانیں گے؟ جن کے گھر کے گھر ختم ہوگئے ہیں وہ بھلا انتقام لینے کی ذہنیت سے کیوں کر دور ہوسکیں گے؟ مائنڈ سیٹ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔

ایم کیو (جو قندھار کے فیلڈ کمانڈر کا رشتہ دار ہے) کہتا ہے کہ بہت سے لوگ کسی قصور کے بغیر ہی مار دیے گئے۔ میرے دو بھائی بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ امریکا کی سربراہی میں اتحادی افواج نے کسی جواز کے بغیر بڑے پیمانے پر لوگوں کو قتل کیا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ملک (مکھیا) کو بھی قتل کردیا گیا۔ ایسے لوگوں (امریکی و اتحادی) کے ساتھ بیٹھ کر ہم چائے کیسے پی سکتے ہیں؟ ایسے میں ہم افغان حکومت سے کس طور بات کرسکتے ہیں؟

ملک کے بہت سے حصوں میں لوگوں کے پاس بیان کرنے کو بہت سے گِلے، شِکوے ہیں۔ ان کے ذہن سے انتقام کا جذبہ کھرچ کر پھینکنا آسان نہیں۔ قندھار کے فیلڈ کمانڈر کا بھائی آرزیڈ کہتا ہے کہ لاکھوں سال گزرنے پر بھی یہ لوگ نہیں مانیں گے اور اپنا بدلہ لے کر رہیں گے۔

افغانستان میں بہت سے دوسرے تنازعات بھی ہیں۔ بعض علاقوں میں مقامی اور غیر مقامی کا جھگڑا ہے۔ وسائل کی تقسیم کے حوالے سے بھی تنازعات پائے جاتے ہیں۔ مرکزی حکومت میں حصے کے لیے بھی کشمکش جاری رہتی ہے۔ ہلمند کے ضلع گرمسر میں مقامی اور غیر مقامی کا جھگڑا ہے۔ غیر مقامی چونکہ غریب اور کمزور ہیں اس لیے انہوں نے طالبان کا ساتھ دینے کو ترجیح دی ہے تاکہ تحفظ حاصل رہے۔ بہت سے چھوٹے نسلی گروہ اپنے کاروباری مفادات کے لیے بھی طالبان اور دیگر مضبوط گروپوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کئی علاقوں میں پوست کی کاشت اور منشیات کی تجارت کو بچانے کے لیے بھی طالبان کا ساتھ دیا گیا۔

تحریکِ طالبان کی مسلح افواج کے سربراہان اور فیلڈ کمانڈرز کا پاکستان میں اجلاس ہوتا رہا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے اواخر میں فوجی سربراہان اور فیلڈ کمانڈرز کو کوئٹہ میں طلب کرکے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے انخلا کے بعد کی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ تمام فیلڈ کمانڈرز نے سیاسی رابطوں کی حمایت کی تاکہ انخلا کے بعد کی صورت حال کو بہتر طور پر سمجھا اور کنٹرول کیا جاسکے۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں طالبان نے باضابطہ اعلان کیا کہ وہ امریکیوں سے رابطے میں ہیں۔

فیلڈ کمانڈرز اگرچہ سیاسی روابط اور بات چیت پر راضی ہیں مگر اب تک یہ واضح نہیں کہ بہت سے معاملات (گرلز اسکول، عمومی معاملات میں خواتین کا کردار اور مخالف گروہ) میں ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ ملا اختر منصور کی ہلاکت کے بعد ہیبت اللہ نے بھی عمومی ہدایات دینے ہی پر اکتفا کیا۔ انہوں نے کہا کہ بنیادی ڈھانچے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، لوگوں کا احترام کیا جائے یعنی انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، امدادی اداروں کے کارکنوں کو ہراساں یا قتل نہ کیا جائے اور دشمنوں کو ہتھیار ڈالنے پر مائل کیا جائے۔ ماضی کو بھولنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی کیونکہ ملا عمر کے انتقال کے بعد ملا اختر منصور کی ہلاکت نے خود تحریک طالبان کے لیے بقا کا مسئلہ کھڑا کردیا ہے۔ یہ سب کچھ ایسا آسان نہیں جیسا دکھائی دیتا ہے۔

ملا عمر کے انتقال کے بعد طالبان رہنماؤں کی سوچ میں تبدیلی کے رونما ہونے کا عمل شروع ہوا ہے۔ تحریک طالبان کے بہت سے ارکان اب بھی کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی فوج کا حصہ بن ہی نہیں سکتے جس میں افغانستان کی سابق قومی فوج کے ارکان شامل ہوں۔ افغان فوج کے اہلکاروں کو تکفیر کا بھی سامنا رہا ہے۔ تحریک طالبان کے ارکان کا موقف ہے کہ جس نے بھی افغانستان میں قائم کی جانے والی اسلامی امارت کی مخالفت کی اور اسے ختم کرنے کے عمل میں حصہ دار بنا وہ کافر ہے۔ اور یہ کہ ایسے لوگوں کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک پریشان کن بات یہ ہے کہ فیلڈ کمانڈرز اور عام جنگجو تو اپنی جگہ ہے، تحریک طالبان سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے اور سوشل میڈیا پر متحرک نوجوان بھی کسی کو معاف کرنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتے۔ ویسے تو کہا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی سیاسی ونگ کا فیصلہ ہوگا، اس کے آگے سرِتسلیم خم کردیا جائے گا۔ قندوز پر طالبان کا قبضہ ختم ہوجانے کے بعد دو ٹی وی چینلز (تولو اور ون افغانستان) نے خاصی جانب دارانہ کوریج کی جس سے بیشتر طالبان خاصے جز بز ہوئے۔ سوشل میڈیا پر طالبان کے پڑھے لکھے اور آن لائن کلچر سے آشنا ارکان کا کہنا تھا کہ ان دونوں چینلز کو سزا ملنی ہی چاہیے۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء میں طالبان کے پیدل سپاہی اور آن لائن دانشور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ تولو اور ون افغانستان کے معاملے میں کسی کو نہ بخشنے کی ذہنیت کارفرما تھی۔ ۲۰ جنوری ۲۰۱۶ء کو ایک وین پر حملہ کیا گیا جس میں تولو چینل کے سات ملازمین مارے گئے۔

مستقبل کی ریاست اور اسلام

ایک عشرے کے دوران طالبان کی طرف سے لاکھوں الفاظ پر مشتمل مواد عوام کے سامنے پیش کیا گیا ہے مگر ایک مستحکم ریاست کس طور معرضِ وجود میں لائی جانی چاہیے اس موضوع پر اس میں کم ہی مواد ہے۔ طالبان رہنماؤں میں بہتر ریاست کے حوالے سے واضح اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ ہم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ طالبان کی اشرافیہ کن اعمال کو ریاستی ذمہ داریوں میں شمار کرتی ہے اور کن کو نہیں۔ اور یہ کہ کن ایشوز کو وہ ریڈ لائن کے درجے میں رکھتی ہے یعنی کن باتوں سے ریاست کے لیے مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں۔

جب مثالی ریاست کی بات ہوتی ہے تو طالبان کی اہم شخصیات شریعت کی بات کرتی ہیں۔ یعنی ریاست ایسی ہو کہ مذہب کی تعلیمات پر عمل آسان ہو۔ ایس این کا کہنا ہے کہ ریاست اسلامی اقدار، قوانین، عوام کے جان و مال اور سرزمین کی محافظ ہوتی ہے۔ یہی ایک شرعی ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ انٹرویوز کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ طالبان رہنماؤں کے نزدیک اسلامی ریاست جان و مال، اقدار اور مذہب کی محافظ ہوتی ہے۔ اور قومی سلامتی و بقا کے لیے بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ وہ بنیادی حقوق، شہری آزادیوں اور سیاسی تفاعل کی زیادہ بات نہیں کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ افغان معاشرے میں جو روایات سیکڑوں برس سے چلی آرہی ہیں ان کا احترام کیا جائے مثلاً آپس کے تنازعات کے حوالے سے قبائلی عمائدین کو فیصلہ سازی میں مرکزی کردار ملنا چاہیے۔

اس وقت افغانستان میں جو آئین نافذ ہے اس پر بیشتر

طالبان رہنماؤں کو بظاہر کوئی اعتراض نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آئین میں شریعت کی بالا دستی کی بات کی گئی ہے۔ ہاں، اس امر پر اعتراض ضرور پایا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں ڈھیل دکھائی گئی ہے اور بیرونی قوتوں کی موجودگی میں آئین پر پوری طرح عمل کیا بھی نہیں جاسکتا۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ افغانستان کے موجودہ آئین میں بعض امور بیرونی قوتوں کی خوشنودی کے لیے رکھے گئے ہیں۔ جب تک اس آئین کو درست نہیں کرلیا جاتا تب تک مستحکم افغانستان کی راہ ہموار نہیں کی جاسکتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکیوں نے افغانستان میں ۱۴ برس سے ہر معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اس لیے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس مدت کے دوران مرتب اور نافذ کیے جانے والے قوانین ہر اعتبار سے صرف افغانستان کے مفادات کی تکمیل میں معاون ثابت ہو رہے ہوں گے۔ دیکھنا پڑے گا کہ امریکیوں کی مرضی کا کیا ہے اور خود افغانوں کے مفاد میں کیا ہے۔

انٹرویوز کے دوران یہ بات بھی کھل کر کہی گئی کہ غیر ملکی قوت تمام معاملات پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ ایسے میں یہ کیونکر مان لیا جائے کہ سب کچھ افغانوں کے مرضی کے مطابق ہوا ہوگا اور ان کے مفاد میں ہوگا۔ افغانستان میں تعینات غیر ملکی اپنے اپنے مشن پر رہے ہیں۔ انہوں نے ملک کو مستحکم کرنے اور اسے اسلامی تعلیمات کے مطابق چلانے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کیوں کی ہوگی؟

دستور اور اسلامی ریاست

طالبان نے بھی ملک کو ایک دستور دیا تھا۔ ایک علماء کونسل قائم کرکے سپریم کورٹ کی منظوری کے ساتھ جون ۱۹۹۸ء میں ایک آئین نافذ کیا گیا۔ جولائی ۲۰۰۵ء میں اس آئین کی ایک بار پھر توثیق کی گئی۔ اس آئین میں امیر المومنین کے انتخاب کا کوئی طریقِ کار نہیں دیا گیا۔ چند ایک شرائط ضرور بیان کردی گئی ہیں مثلاً امیر المومنین مرد اور فقہ حنفی کا پیروکار ہونا چاہیے وغیرہ۔ امیر المومنین کے انتخاب کا طریقِ کار واضح نہ ہونے کے باعث ہی ملا عمر کے انتقال کی خبر آنے پر ان کے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ملا وکیل احمد متوکل نے ۱۹۹۶ء میں ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ تحریک طالبان میں تمام فیصلے امیر کرتے ہیں۔ جو انہوں نے کہہ دیا وہی فیصلہ ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ان کا کیا ہوا فیصلہ سنت کے مطابق ہے۔ امیر المومنین اگر خود منصب چھوڑنا چاہیں تو چھوڑ دیں یا پھر شریعت نافذ کرنے سے انکار پر انہیں ہٹایا جاسکتا ہے۔ منصب سے امیر المومنین کو ہٹانے کی اور کوئی صورت نہیں۔ امیر المومنین کی موجودگی میں حکومت پابند ہوگی کہ ان کی مرضی کے مطابق کام کرے۔

طالبان رہنماؤں کا کہنا ہے کہ امیر المومنین کی موجودگی میں وزارتی کونسل ان کے ماتحت کام کرے گی اور اس کے سربراہ کو وزیر اعظم کا سا درجہ حاصل ہوگا۔ ملا عمر کے دورِ امارت میں ملا محمد ربانی اس کونسل کے سربراہ تھے۔ انٹرویوز میں طالبان رہنماؤں کا یہ بھی کہنا تھا کہ دورِ امارت میں لایا جانے والا دستور حتمی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ ایک عبوری دور گزرنے پر حالات کا تجزیہ کرکے زیادہ ٹھوس اور جامع دستور لانے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ طالبان کے دورِ امارت میں دستور کے مطابق قائم کی جانے والی اسلامی کونسل قانون ساز ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔

۲۰۱۰ء سے طالبان رہنماؤں کی گفتگو سے دستور غائب ہوگیا۔ انہوں نے ایک نئے سیاسی فریم ورک کی بات شروع کی جس میں انخلا کے بعد کی صورت حال سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت ہو اور تمام فریقوں کو ملا کر چلنے کا اہتمام کیا جائے۔ ملا عمر کی موت کی خبر آنے پر اب یہ عمل بھی تھم سا گیا ہے۔

طالبان رہنما اب اس نکتے پر متفق ہیں کہ آئین ہر اعتبار سے متفقہ ہونا چاہیے۔ کوئی بھی ایسا آئین قبول نہیں کیا جاسکتا جو شریعت کی طے کردہ حدود و قیود سے تجاوز کرتا ہو۔ اس کے لیے ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیے جس میں جید علماء کے ساتھ قانونی امور کے ماہرین بھی شامل ہوں۔

انٹرویوز میں طالبان رہنماؤں کی اکثریت نے تسلیم کیا کہ موجودہ آئین اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی ہے مگر ریاست اسلامی نہیں کیونکہ اُس نے معاملات کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ ان کے خیال میں آئین کے ڈھانچے کو کسی حد تک تبدیل کرنا پڑے گا تاکہ طالبان کو قبول کرنے کی گنجائش پیدا ہو۔

ایل ایم کا موقف یہ ہے کہ افغانستان کا موجودہ آئین غیر ملکیوں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر لکھا گیا تھا۔ اب ضروری ہے کہ قومی مفادات کو تقویت بہم پہنچانے کے لیے اس میں ضروری تبدیلیاں لائی جائیں۔ ایک مشکل یہ ہے کہ آئین میں اسلام کا ذکر تو ہے مگر شرعی قوانین نافذ کرنے کی گنجائش کم رکھی گئی ہے۔ شرعی تعلیمات پر عمل بھی نہیں کیا جارہا۔ دوسری طرف اسی آئین میں بین الاقوامی قوانین کے احترام کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ اب ایسے آئین کی ضرورت ہے جس میں توازن بھی ہو اور تسلسل بھی۔ طالبان رہنماؤں کا کہنا ہے کہ انہیں موجودہ آئین پر کچھ زیادہ اعتراض نہیں مگر معاملہ عمل کے میدان میں سیاسی کمزوریوں کا ہے۔ ابھی تک یہ واضح نہیں کہ غیر ملکی افواج اور قومی فورسز سے برسر پیکار فیلڈ کمانڈرز اور عام طالبان اس آئین کے حوالے سے کیا سوچ رکھتے ہیں۔ اگر فیلڈ کمانڈرز ۱۹۹۰ء کے عشرے کے مائنڈ سیٹ کے ساتھ جی رہے ہیں تو پھر ہمیں اُن کی طرف سے آئین کی شدید مخالفت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

سیاسی نمائندگی

طالبان رہنماؤں نے موجودہ انتخابی نظام کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے گریز کیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انتخابی نظام کے بارے میں کم ہی جانتے ہیں یا اظہار خیال کرتے ہیں۔ مغرب کی لبرل ڈیموکریسی کے خلاف جانا بیشتر اسلام پسندوں کی طرح طالبان کا بھی وتیرہ رہا ہے مگر اس کی باضابطہ فکری یا نظریاتی نہیں بلکہ سیاسی وجوہ ہیں۔ ان کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ ایک شخص ایک ووٹ کا نظریہ درست نہیں کیونکہ سب کی ذہنی سطح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک ناخواندہ یا جاہل شخص کسی ایسے شخص کے برابر کیسے کھڑا ہوسکتا ہے جس کی ٹھوس علمی حیثیت ہو اور جو ہر معاملے میں علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو۔ طالبان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انتخابی نظام میں دھاندلی بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ووٹرز چونکہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں، اس لیے بے قاعدگی اور دھاندلی کا امکان مسترد کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس سلسلے میں افغانستان کے صدارتی انتخابات کی مثال دیتے ہیں۔ موجودہ صدر اشرف غنی جن حالات میں صدر منتخب ہوئے وہ کسی بھی اعتبار سے پسندیدہ قرار نہیں دیے جاسکتے۔ سابق وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ کے مقابل اشرف غنی نے پراسرار حالات میں کامیابی حاصل کی۔ طالبان رہنماؤں کا خیال ہے کہ اشرف غنی کو کامیابی دلانے والا انتخاب آزادانہ اور شفاف نہ تھا۔ طالبان رہنماؤں نے سوال انتخابات پر نہیں بلکہ ان کے طریقِ کار پر اٹھایا ہے۔

طالبان کی صفوں میں یہ معاملہ اب تک طے نہیں ہو پایا ہے کہ انتخابات کے لیے کون سا طریقہ بہتر یا سودمند رہے گا۔ جمہوریت اور انتخابات کے بارے میں زیادہ غور و خوض کو اب تک راہ نہیں دی گئی۔ ویسے انتخابات کو مکمل طور پر مسترد کرنے والے خال خال ہیں۔ طالبان کے جن رہنماؤں سے بات کی گئی ان میں سے چند نے انتخابات کو مثبت قرار دیا ہے۔ بعض کے خیال میں معاملہ مشکوک ہے اور چند ایک نے اس معاملے

میں غیر جانب دارانہ رائے رکھنے کا اعلان کیا۔ یعنی واضح مخالفت موجود نہیں۔ اس معاملے میں طالبان قیادت نے پاکستان میں دیوبندی تحریک کی جماعتوں سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) کے تجربے سے استفادہ کر کے درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

طالبان نے جمہوریت کو بھی مکمل طور پر مسترد کرنے سے گریز کیا ہے۔ چند ایک امور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ووٹ والا معاملہ طالبان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ نہیں۔ اے ایم سابق وزیر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پارلیمانی نظام اپنانے میں کچھ حرج نہیں مگر اس کی نوعیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ افغانستان چونکہ دیہی معاشرہ ہے اس لیے پارلیمانی نظام میں نمائندگی ضلعی سطح سے ہونی چاہیے۔ یہ بات طالبان کے نافذہ کردہ دستور کے مطابق بھی ہے۔ ضلعی نظام پر نمائندگی کا تعین موجودہ صدارتی نظام سے بھی کسی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ سو اس روٹ لیول پر حقیقی نمائندگی کی راہ ہموار کرنے کا ہے۔ اگر پارلیمانی جمہوریت کا یہ طریقہ اپنایا جائے گا تو افغانستان میں انتخابی طریقِ کار سے متعلق تمام اختلافات پر قابو پانے میں غیر معمولی حد تک مدد ملے گی۔

اے ایم کا خیال ہے کہ قانون ساز اسمبلی اور عدلیہ میں علمائے کرام کو نمایاں نمائندگی دینے سے معاملات کو سلجھانے میں مدد ملے گی۔ ایسی صورت میں ان کے اقتدار میں آنے یا اقتدار کے معاملات میں براہِ راست ملوث ہونے کی راہ بھی مسدود کی جا سکے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اے ایم نے یہ بھی کہا کہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔

علمائے کرام کو قانون ساز اداروں اور عدلیہ میں بڑے پیمانے پر نمائندگی دینا بھی جمہوری اصولوں کی صریح نفی ہے۔ اِسے درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر ایک بڑے مسئلے کا حتمی حل سمجھ کر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دیہات میں بہت سے فیصلے جرگوں میں ہوتے ہیں۔ قبائلی عمائدین اور مذہبی پیشوا معاملات کو مل کر حل کرتے ہیں۔ حکومت کا نظم و نسق چلانا بہت مختلف کام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرگہ سسٹم بعض معاملات میں بہت اچھا ہے کیونکہ عدالتی پیچیدگیوں سے جان چھڑانے میں مدد ملتی ہے۔

چند ایک طالبان رہنماؤں نے درمیانی جمہوریت کے حق میں رائے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ براہِ راست حق رائے دہی استعمال کرنے کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے عمائدین کے ووٹوں سے حکومت تشکیل دی جائے۔ مغرب کی لبرل ڈیموکریسی میں ایک شخص ایک ووٹ کا اصول رائج ہے۔ اس سے بہتر یہ قرار دیا گیا کہ عمائدین پورے علاقے یا برادری کی طرف سے ووٹ دیں اور حکومت سازی میں معاونت کریں۔ ایل ایم کا کہنا تھا کہ جب تک کوئی واضح نظام اپنا نہیں لیا جاتا تب تک لازم ہے کہ سربراہِ مملکت یا تو جرگے کے ذریعے منتخب کیا جائے یا پھر اہل حل وعقد یعنی جید علمائے کرام مل کر صدر کا انتخاب کریں۔ اہل حل وعقد کی رائے ہی سے برہان الدین ربانی کو دو سال کے لیے صدر منتخب کیا گیا تھا اور ملا عمر بھی اِسی طریقہ سے امیر المومنین منتخب کیے گئے تھے۔

انٹرویوز میں چند طالبان رہنماؤں نے کہا کہ طالبان کی اکثریت مغرب کی لبرل ڈیموکریسی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ مغربی جمہوریت کے ڈھانچے کو اپنانے کی صورت میں علمائے کرام کے لیے گنجائش کم ہی نکل پائے گی۔ ایس ایچ کا کہنا ہے کہ اہل حل و عقد کے ہاتھوں انتخابی عمل کا طے کیا جانا ایک اچھا راستہ ہے۔ اگر معاملات درست انداز سے انجام کو پہنچیں تو اہل امیدوار کامیاب ہوں گے اور ملک کو چلانے کے لیے بہتر لوگ میسر آسکیں گے۔ ہر انسان کی رائے مستند نہیں ہوتی۔ اہل علم جب کسی معاملے میں رائے دیتے ہیں تو وہ ٹھوس اور قابل عمل ہوتی ہے۔ عام آدمی میں وہ سیاسی بصیرت نہیں ہوتی جو بہتر فیصلوں کے لیے درکار ہوا کرتی ہے، خاص طور پر ملک چلانے والوں کا انتخاب کرنے کے معاملے میں۔ اہل حل وعقد کے ذریعے انتخابی عمل مکمل کرانے کی صورت میں بے ایمانی یا بے ضابطگی کی گنجائش بھی برائے نام رہ جائے گی۔

سی ایچ کی رائے یہ ہے کہ کوئی ایسا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جس پر چل کر جمہوری تقاضے بھی پورے ہوں اور انتخابی عمل بھی معتبر ہو جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ صدر کا انتخاب علمائے کرام اور قانونی ماہرین کی مدد سے عمل میں لایا جا سکتا ہے اور وزیر اعظم لبرل ڈیموکریسی کے اصول کے مطابق عوام کے ووٹوں سے براہ راست منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں خواص کے منتخب کردہ صدر کے مقابل عوام کا منتخب کردہ وزیر اعظم ہوگا اور دنیا کو اندازہ بھی ہو جائے گا کہ کس کا انتخاب درست تھا۔ ایسی صورت میں معاملات کو سلجھانے میں خاطر خواہ حد تک مدد مل سکے گی۔

دنیا بھر میں انتخابی سیاست سے اسلامی تحاریک کو شدید نقصان پہنچتا رہا ہے۔ مصر کی مثال بہت واضح ہے جہاں اخوان المسلمون نے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تو فوج نے اسے اقتدار سے دور رکھا اور عوام کے منتخب صدر کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر اس پر مقدمات بھی چلائے گئے۔ الجزائر میں بھی اسلام پسندوں کی انتخابی کامیابی فوج سے ہضم نہیں ہو پائی تھی۔ تحریک طالبان سے وابستہ سرکردہ شخصیات کا استدلال ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت اور انتخابی طریقِ کار سے اسلامی تحاریک کو نقصان ہی پہنچتا رہا ہے، اس لیے اس پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک طالبان کی مطبوعات میں انتخابی سیاست کے خلاف مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

بی ایس کا کہنا ہے کہ حماس بھی انتخابی فتح کے باوجود فلسطین میں کچھ خاص نہیں کر پائی۔ انتخابی نظام کو صرف ایسی حالت میں قبول کیا جا سکتا ہے کہ مذہبی تعلیمات پر عمل اور بنیادی اقدار کے تحفظ کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ پی ڈی کی رائے یہ ہے کہ انتخابی سیاست سے اسلامی تعلیمات کے فروغ اور معاشرے کی بنیادی اقدار کے تحفظ کی راہ ہموار ہوتی ہو تو یہ قابل قبول ہے ورنہ نہیں۔ بیشتر طالبان رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اگر یہ محض مغرب کی نقل ہو تو اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی ہیئت اور ضروریات ہوتی ہیں اور لازم ہے کہ ان کا احترام کیا جائے۔

ایل اے کی رائے یہ ہے کہ طالبان کی اکثریت انتخابات کے خلاف نہیں مگر اس نکتے پر ضرور بحث ہوتی ہے کہ نتائج کیا ہوں گے۔ اگر انتخابات عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے کی راہ ہموار نہ کرتے ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کا کوئی جواز ہے نہ ضرورت۔

پی ڈی اور ایل ایم کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ انتخابات کا جواز دراصل اجتہاد کا معاملہ ہے۔ علمائے کرام اور قانونی امور کے ماہرین کو اس معاملے پر زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہیے تاکہ عوام کی رہنمائی کا اہتمام کیا جا سکے۔ اگر انتخابات شرعی اصولوں کے مطابق ہیں تو عوام کو بتایا جائے تاکہ وہ مزید الجھنے سے محفوظ رہیں۔ اور اگر شرعی جواز نہیں بنتا تب بھی بتایا جائے تاکہ عوام کی کوئی رائے قائم ہو سکے۔ فی زمانہ انتخابی نظام ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کچھ کمی ہے تو شرائط منسلک کر کے پوری کی جا سکتی ہے۔

ایل ایم کا کہنا ہے کہ طالبان کی صفوں میں انتخابات کے خلاف سخت آراء نہیں پائی جاتیں۔ یہ کوئی بہت بڑا فکری یا نظریاتی چیلنج نہیں۔ نہ اس بات پر کسی کو کچھ اعتراض ہے کہ اقتدار کی سیاست کیوں کر بروئے کار لائی جاتی ہے۔ سوال اسلامی تعلیمات پر عمل کا ہے۔ جن اقدار کے لیے لڑتے آئے ہیں اگر انہی اقدار کا دفاع ممکن نہ ہو تو پھر کوئی بھی سیاسی نظام کام کا نہیں۔

|||

''دنیا جنگ کی تیاری کر رہی ہے!''

Mikhail Gorbachev

دنیا آج مسائل میں گھری ہوئی ہے، پالیسی مرتب کرنے والے بھی تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ مگر کوئی بھی مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کہ جتنا سیاست میں اسلحہ کا عمل دخل اور اس کو حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل ہونا ہے۔ اس مقابلے کی فضا کو ختم کرنا اور اسلحہ کی دوڑ سے کنارہ کشی ہی پالیسی سازوں کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ موجودہ صورت حال بہت تشویش ناک ہے۔

بڑی تعداد میں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور فوجی یورپ لائے جا رہے ہیں۔ نیٹو اور روسی افواج کے ہتھیار جو پہلے ایک فاصلے پر ہوا کرتے تھے، اب بالکل ایک دوسرے کے نشانے پر ہیں۔ جہاں ریاستیں عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مشکلات کا شکار ہیں، وہیں فوجی اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے مہلک ہتھیاروں کے لیے فنڈ بہت آسانی کے ساتھ مہیا کر دیے جاتے ہیں، جو کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایک آبدوز صرف ایک حملے سے آدھا برِ اعظم تباہ کر سکتی ہے، اور ایسے دفاعی میزائل سسٹم جو تزویراتی توازن میں بگاڑ پیدا کر سکتے ہیں۔

سیاست دان اور فوجی رہنما سمیت مشیران دفاع اب خطرناک عزائم کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ پر موجود تمام شخصیات بھی اِسی دھن میں ہیں۔ یوں نظر آ رہا ہے جیسے دنیا کسی جنگ کی تیاری میں ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران امریکا کے ساتھ مل کر ہم نے ایک لائحہ عمل مرتب کیا تھا جس کے نتیجے میں ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد میں کافی حد تک کمی ہوئی تھی اور ایک بڑا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اب تک روس اور امریکا نے جو رپورٹ NPTR کانفرنس میں پیش کی ہے، اس کے مطابق سرد جنگ کے زمانے کے ۸۰ فیصد ہتھیاروں کو ناقابلِ استعمال بنا دیا گیا ہے۔ کسی حادثے یا ٹیکنیکل خرابی کی صورت میں ایٹمی جنگ کے امکان بہت حد تک کم ہو گئے تھے۔ یہ سب ایٹمی ہتھیار رکھنے والے ممالک کے سربراہان کی مثبت سوچ کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ ایٹمی جنگ کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

نومبر ۱۹۸۵ء میں جنیوا میں ہونے والی پہلی کانفرنس میں سوویت یونین اور امریکا کے رہنماؤں نے اس بات کا اعلان کیا کہ ''ایٹمی جنگ کبھی جیتی نہیں جا سکتی لہٰذا اسے لڑنا فضول ہوگا۔ ہماری افواج ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔'' اس اعلان سے دنیا نے سکون کا سانس لیا۔

مجھے ۱۹۸۶ء میں ہونے والا Politburo کا وہ اجلاس یاد آ رہا ہے، جس میں مختلف ''دفاعی ڈکٹرائن'' پر گفتگو کی گئی تھی۔ اختتام پر جو دستاویز تیار کی گئی اس میں ''کسی بھی حملے کا ہر طریقہ سے جواب دیا جائے گا'' جیسی سخت زبان استعمال کی گئی تھی، جس کی پولٹ بیورو کے ارکان نے مخالفت کی اور کہا کہ ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال صرف جنگ روکنے کے لیے کیا جائے اور اصل مقصد دنیا کو ان مہلک ہتھیاروں سے پاک کرنا ہونا چاہیے۔

آج بہرحال دنیا میں ایٹمی جنگ کے امکانات ظاہر اور عالمی طاقتوں کے تعلقات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اسلحہ تیار کرنے والی صنعتیں اپنی فعالیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ہمیں اس صورتحال کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں مذاکرات کے ذریعے سے مشترکہ حکمت عملی بنانی ہوگی اور مسائل کا سیاسی حل نکالنا ہوگا۔

ایک سوچ یہ پائی جاتی ہے کہ مذاکرات کا مرکزی نکتہ دہشت گردی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ یقیناً یہ بہت اہم اور فوری کام ہے، مگر تعلقات کے ضمن میں یہ ناکافی ہے۔ ہمیں ایک دفعہ پھر اپنی توجہ اسلحہ کی دوڑ کے خاتمے اور ایٹمی جنگ سے دنیا کو بچانے کی طرف مرکوز کرنی ہوگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلحے کی مقدار میں کمی اور دفاعی میزائل نظام کو بھی زیرِ بحث لانا ہوگا۔

اس دورِ جدید میں جنگ کو باقاعدہ طور پر غیر قانونی قرار دینا چاہیے، کیونکہ نہ ہی اس سے غربت کا خاتمہ ہو سکتا ہے، نہ ماحولیاتی کشیدگی میں کمی کی جا سکتی ہے، نہ مہاجرین کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ ہی درپیش دیگر مسائل کا حل جنگ سے ممکن ہے۔

میں سلامتی کونسل کے ارکان سے اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے میں پہلا قدم وہ اٹھائیں اور سربراہان مملکت کی سطح پر اس قرارداد کو منظور کروائیں کہ ایٹمی جنگ ناقابل قبول ہے اور کبھی بھی نہیں لڑی جانی چاہیے۔ اور میرے خیال میں یہ اقدام ڈونلڈ ٹرمپ اور ولادی میر پوٹن کی جانب سے ہونا چاہیے، کیوں کہ دنیا کے ۹۰ فیصد ایٹمی ہتھیار ان ممالک کے پاس ہیں اور اس لیے ان کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔ صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے کہا تھا کہ ''آزادی کا ایک اہم جز خوف سے آزادی ہے''۔ آج کروڑوں لوگ اس خوف کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کی وجہ اسلحہ کی دوڑ، ایٹمی ہتھیار اور خطرناک فوجی جنگیں ہیں۔ اگر دنیا کو اس خوف سے آزاد کر دیا جائے تو باقی مسائل کا حل بھی مشکل نہیں۔ (ترجمہ: عبدالرحمٰن کامران)

"Mikhail Gorbachev: 'It All Looks as if the World Is Preparing for War'." ("Time". Jan. 26, 2017)

بقیہ: بنگلا دیش میں نصاب کا جھگڑا

سابق دورِ حکومت میں وزارتِ تعلیم کی مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والی رشیدہ کے چوہدری اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب تک یہ بات کھل کر سامنے نہیں آ رہی کہ حکومت کو یہ سب کچھ کرنے پر کس نے آمادہ یا مجبور کیا۔ کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسری طرف والدین بھی الجھے ہوئے ہیں۔ رشیدہ کے چوہدری کہتی ہیں کہ بہت سے والدین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہم اپنے بچوں کو گھر پر پڑھانا شروع کر دیں۔

حفاظتِ اسلام نے درستی کتب اور نصاب میں مزید تبدیلیوں کی تیاری شروع کر دی ہے۔ اب فنون لطیفہ کی باری ہے۔ حفاظتِ اسلام کی مرکزی شوریٰ کے رکن عبداللہ واصل کہتے ہیں کہ بچوں کو فنون لطیفہ کے نام پر جاندار چیزوں کی تصاویر یا مجسمے بنانے کی تربیت نہیں دی جانی چاہیے۔ اس کے بجائے خطاطی پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔ مفتی فیض اللہ نے بتایا کہ ان کی تنظیم درسی کتب سے ایسی تمام ورزشوں کو بھی خارج کرانا چاہتی ہے جن میں لڑکیوں یا خواتین کو ورزش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ مردوں کی دنیا الگ ہے اور خواتین کی دنیا بالکل الگ۔ جو کچھ لڑکے کر سکتے ہیں وہ لڑکیاں نہیں کر سکتیں۔ لڑکے درختوں پر چڑھ سکتے ہیں، لڑکیاں نہیں چڑھ سکتیں۔ ایسے میں لڑکیوں کو اس نوعیت کی ورزش کرتے دکھانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حفاظتِ اسلام دراصل مخلوط تعلیم کے خلاف ہے اور چاہتی ہے کہ پانچویں جماعت کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ کلاسوں میں پڑھایا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ مخلوط تعلیمی نظام سے پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیوں میں ایک دوسرے کو قبول کرنے کا رجحان بڑھتا جاتا ہے اور وہ نکاح کے بغیر تعلقات استوار کرنے کو بھی درست سمجھنے لگتے ہیں۔

حفاظتِ اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین پروفیسر نارائن چندر ساہا سمیت تمام ارکان کو ہٹا دیا جائے۔ مفتی فیض اللہ کا کہنا ہے کہ ''ہم پروفیسر نارائن چندر ساہا کے خلاف نہیں مگر بات یہ ہے کہ عوام کے جذبات سے ہم آہنگ نصاب تیار کرنے کے لیے کوئی ایسی شخصیت چاہیے، جو اسلامی تعلیمات کو ان کی روح کے مطابق خوب سمجھتی ہو۔ ہم کسی ہندو ماہر تعلیم سے اس کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ بول کے پیڑ پر گلاب نہیں اُگتے۔'' (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"To Secular Bangladeshis, Textbook Changes Are a Harbinger". ("nytimes.com". Jan. 22, 2017)

لال بھبھو کا اسرائیل

وسعت اللہ خان

لاڈلا ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ بُری بات یہ ہے کہ لاڈلا ڈ میں بچہ اتنا بگاڑ دیا جائے کہ وہ والدین سمیت ہر کسی سے بدتمیزی کو ایک معمول سمجھنے لگے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب باپ سرزنش کرنے لگے تو بچے کے آگے ماں کھڑی ہو جائے اور ماں ڈانٹنے لگے تو باپ بچہ کو گود میں اٹھالے۔ چنانچہ ایک دن بچہ سر پہ مُوتنا شروع کر دیتا ہے اور اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اگر عالمی برادری کو ایک بڑا کنبہ سمجھ لیا جائے، تو جس بچے نے سب سے زیادہ ناک میں دم کر رکھا ہے وہ اسرائیل ہے۔ پہلے تو ماں (برطانیہ) نے تربیت کے تمام بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھا۔ بعد ازاں سوتیلے باپ (امریکا) نے اگلی پچھلی تمام کسر نکال دی اور بچے (اسرائیل) کو عملاً باپ کا درجہ دے دیا۔ اور پھر پھوپھی جان (کانگریس) نے تو چاہت دکھانے میں سب کو مات کر کے یہ محاورہ بھی غلط ثابت کر دیا کہ ''ماں سے زیادہ چاہے پھا پھا کٹنی کہلائے''

اقوامِ متحدہ کے ویسے تو ۱۹۳ ممالک رکن ہیں۔ لیکن اب تک جس ممبر کی حرکتوں کے خلاف جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل اور اقوامِ متحدہ کے پانچ ذیلی اداروں میں سب سے زیادہ قرار دادیں پیش ہوئیں، وہ اسرائیل ہے۔ اسرائیل کی پیدائش سے اب تک کوئی برس ایسا نہیں گزرا جب جنرل اسمبلی میں اسرائیل کی کسی حرکت کی مذمت میں کوئی قرارداد منظور نہ ہوئی ہو۔ ۲۰۰۳ء میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کونسل وجود میں آئی، تب سے اب تک اس کونسل نے انسانی حقوق کی پامالی کے ضمن میں جس ملک کی سب سے زیادہ مذمت کی وہ اسرائیل ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سب سے اہم ادارے یعنی سلامتی کونسل میں آج تک فلسطین اسرائیل تنازعے پر ۲۲۶ قراردادیں پیش کی جا چکی ہیں۔ زیادہ تر کو امریکا نے ویٹو کر دیا۔ لیکن سلامتی کونسل بہت سی اہم قراردادیں اس لیے منظور کر پائی کیونکہ امریکا نے رائے شماری سے غیر حاضر رہنے کا فیصلہ کیا۔

اسرائیل کے خلاف اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے جو قرار دادیں متفقہ طور پر منظور کیں، ان میں سب سے اہم ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد کی قرارداد نمبر ۲۴۲ ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر کے ۵ جون ۱۹۶۷ء کی سرحدوں تک واپس چلا جائے اور ہمسایہ ممالک سے اپنے تنازعات پُرامن طریقے پر نمٹائے۔

آج تک سلامتی کونسل میں لگ بھگ تین درجن قراردادیں اس لیے منظور ہو سکیں کیونکہ امریکا نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ مثلاً صدر لنڈن بی جانسن کے دور میں سلامتی کونسل اسرائیل عرب تنازعے کے تناظر میں ۷، نکسن کے دور میں ۱۵، فورڈ کے دور میں ۲، کارٹر کے دور میں ۱۴، ریگن کے دور میں ۲۱، بش سینئر کے دور میں ۹، کلنٹن کے دور میں ۱۳ اور بش جونیئر کے دور میں ۶ قراردادیں منظور کرنے میں کامیاب ہو پائی۔ ایک تاثر یہ ہے کہ اوباما کے آٹھ سالہ دور میں اسرائیل امریکا تعلقات میں مسلسل کشیدگی رہی اور اسرائیلی وزیرِ اعظم نیتن یاہو سے اوباما کی کبھی نہیں بنی۔ ہو سکتا ہے یہ تاثر درست ہو، مگر اوباما پہلے امریکی صدر ہیں جنھوں نے سلامتی کونسل میں اسرائیل کے خلاف ۲۳ دسمبر ۲۰۱۶ء سے قبل ایک بھی قرارداد منظور نہیں ہونے دی۔ مگر جاتے جاتے اوباما کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا اور چار دن پہلے ۱۵ رکنی سلامتی کونسل نے امریکی غیر حاضری کے طفیل صفر کے مقابلے میں ۱۴ ووٹوں سے ایک ایسی قرارداد منظور کرنے میں کامیابی حاصل کر لی جس پر فوری طور پر تو شاید عمل نہ ہو پائے لیکن مستقبل کی خودمختار اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں یہ قرارداد ایک اہم قانونی و اخلاقی سنگِ میل ضرور بنے گی۔

اس قرارداد میں کھل کر کہا گیا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کے قبضے میں آنے والے فلسطینی علاقے اور مشرقی بیت المقدس میں اسرائیل نے جو یہودی بستیاں تعمیر کی ہیں، وہ غیر قانونی ہیں اور یہ بستیاں اسرائیل اور فلسطین کے مابین دو ریاستی حل کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ ہیں۔ لہٰذا مزید تعمیراتی کام فوری طور پر روکا جائے اور ان بستیوں کو ختم کیا جائے۔ ۲۰۱۱ء میں ایسی ہی قرارداد امریکا نے یہ کہہ کر ویٹو کر دی تھی کہ بستیوں کے مستقبل کا معاملہ اسرائیلی و فلسطینی مذاکرات کاروں کو دوطرفہ طور پر طے کرنا چاہیے۔ تاہم چار برس بعد اس قرارداد کو امریکا نے آسانی سے منظور ہونے دیا۔

اسرائیل اس وقت صدمے سے دوچار ہے۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ اوباما جاتے جاتے ''اپنے دوست'' کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں گے۔ یہ قرارداد دراصل مصر نے تیار کی تھی مگر نومنتخب امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ اور اسرائیلی وزیرِ اعظم نیتن یاہو کی درخواست پر مصر کے فوجی حکمران جنرل عبدالفتح السیسی نے یہ قرارداد پیش نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ البتہ سلامتی کونسل کے دیگر غیر مستقل ارکان سینیگال، نیوزی لینڈ، یوکرین، ملائشیا اور وینزویلا نے اس قرارداد کو اُچک لیا اور جمعہ کے اجلاس میں پیش کر دیا۔ امریکا نے ویٹو کے بجائے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ یوں دیگر چار مستقل ارکان برطانیہ، فرانس، روس اور چین کی حمایت سے منظوری کا کارنامہ ممکن ہو گیا۔ اور تو اور مصر نے بھی غیر حاضر رہنے کے بجائے قرارداد کے حق میں ووٹ ڈالا۔

اسرائیل نے سلامتی کونسل کے ۱۴ ارکان کے سفیروں کو تل ابیب کے دفترِ خارجہ میں طلب کر کے باضابطہ احتجاج کیا۔ سینیگال اور یوکرین کے وزرائے خارجہ کے مجوزہ اسرائیلی دورے منسوخ کر دیے گئے۔ پہلی بار امریکی سفیر ڈین شپیرو کو نیتن یاہو کے دفتر میں طلب کر کے احتجاجی مراسلہ تھمایا گیا۔ اقوامِ متحدہ کے پانچ ذیلی اداروں سے تعاون اور مالی معاونت معطل کر دی گئی۔ فلسطینی اتھارٹی سے سویلین معاملات پر تعاون روک دیا گیا۔ نیتن یاہو نے الفاظ چبائے بغیر کہا کہ ''اس ڈرامے کے پیچھے اوباما اور امریکی وزیرِ خارجہ جان کیری کا ہاتھ ہے''۔

نامزد امریکی صدر ٹرمپ نے اپنے ٹویٹر ردِعمل میں کہا کہ ۲۰ جنوری (عہدۂ صدارت سنبھالنے کی تاریخ) کے بعد اقوامِ متحدہ کے ساتھ معاملات میں تبدیلی آئے گی۔ طاقتور امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی، ورلڈ جوئش کانگریس، متعدد ڈیموکریٹ اور ری پبلکن ارکانِ کانگریس اوباما پر شدید طیش میں ہیں۔ مگر منہ سے جھاگ نکالنے کے سوا جاتے صدر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

۱۹۷۴ء میں جب ''دہشت گرد'' یاسر عرفات نے پہلی بار اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے روم پر بطور مہمان مقرر یہ کہا تھا کہ ''میرے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں شاخِ زیتون ہے۔ اس شاخ کو گرنے مت دیجیے''۔ تب سے آج تک بے شمار رکاوٹوں کے باوجود فلسطینیوں نے اپنی شناخت تسلیم کروانے کے سفر میں حسبِ توقع پیش رفت نہ ہونے کے باوجود بھی زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ۱۲۶ ارکان فلسطینی اتھارٹی تسلیم کر چکے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی دستاویزات میں اب فلسطینی اتھارٹی کو اسٹیٹ آف فلسطین لکھا جاتا ہے۔ فلسطینی ریاست کو قانوناً اپنی زمینی و فضائی حدود پر اختیار ہے۔ یہ ریاست تمام بین الاقوامی تنظیموں کی رکن بننے کی اہل ہے۔ یہ اسرائیل کو جرائم کی بین الاقوامی عدالت میں گھسیٹنے کی بھی مجاز ہے۔

معاملات سست رفتار سہی مگر درست سمت میں جا رہے ہیں اور قوی امکان ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ہی ایک آزاد اور خود مختار فلسطین دیکھ لیں گے۔ وقت سے لڑنے والوں کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور وقت فلسطینیوں کے ساتھ ہے۔

(بحوالہ: ''ڈیلی ڈاٹ پی کے''۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۶ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950